ماہنامہ

قلندر شعور

جون ۲۰۲۵ء

سُکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور رُوح کے عرفان کے بغیر سُکون نہیں مِلتا

اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ربّ راضی سبّ راضی

جلد 13 شمارہ 5 | جون 2025ء | ذوالحج ـ محرم 47-1446ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ
قلندر شعور کراچی
Neutral Thinking
(اردو ـ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ
حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر
حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی رحمۃ اللہ علیہ

ایڈیٹر
حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر
محمد ایاز

باہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ـــ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 140 روپے.....سالانہ ہدیہ 2100 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرونِ پاکستان 75 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان ـ فون نمبر: 6912020 (0)213 92+

۲۸ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ ____ طفیلؔ ہوشیارپوری 6

نعت رسول مقبول ﷺ ____ اخترؔ آنولوی 7

رباعیات ____ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ 8

آج کی بات ____ مدیرِ مسئول 10

فقیر کی ڈاک ____ ادارہ 14

نامے میرے نام ____ خانوادہ سلسلۂ عظیمیہ 16

شرح نظریۂ رنگ و نور ____ خواجہ شمس الدین عظیمیؒ 21

دروازے کے پار کیا کچھ منتظر ہے! ____ (M.A.Fine Arts) حامد ابراہیم 29

گیارہ ہزار حواس ____ روحانی بانو 37

مصروفیت کے رنگ ____ (Ph.D. Colour Therapist) پروفیسر ڈاکٹر ثمینہ عامر 41

حضرت بسیرہؓ ____ عنبرین ساجد 47

گم شدہ شہر ____ نیّر اعظم 53

برف پانی ____ (M.Phil. Supply Chain) بلال حسن 59

360 ڈگری ______ محمد علی ضیا (M.A. Economics) 61

اپریل 2025ء کے سرورق کی تشریح ______ قارئین 66

میں نے کیا سنا ؟ | اللہ کے دوست ______ عرفانہ شہزاد 73

ایثار کی اسپیس ______ گُلِ نسرین 79

مثنوی مولانا رومؒ | الوداع ـــ الفراق ______ مترجم: قاضی سجاد حسین 85

دانائی کی طرز ______ ڈاکٹر نعیم ظفر (Ph.D.) 89

صدقہء جاریہ ______ عابد محمود 95

مانگے کی کتابیں ______ کنہیالال کپور 101

کورشِ اعظم ______ محمد عدنان خان (M.Sc. Applied Physics) 107

اقتباسات ______ خواتین و حضرات 113

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر ______ عظیمی خواجہ شمس الدینؒ 115

123 Azhar Hussain ______ Bubbles

127 Bibi Anuradha (UAE) ______ The Train Journey

131 Dr. Muneebuddin Kareem (Canada) ______ Desires

136 K. S. Azeemi ______ Message of the Day

حمد باری تعالیٰ

طفیلؔ ہوشیارپوری

زمیں سے آسماں تک ہے ترے جلووں کی تابانی
تری ہستی ہے پھر بھی ماورائے فکرِ انسانی

بغیر اذن اک پتّہ بھی جنبش کر نہیں سکتا
جہانِ بحر و بر پر ہے مسلّم تیری سلطانی

تو اپنی ذات میں واحد تو اپنی شان میں یکتا
نہیں تیرا کوئی ہمسر، نہیں تیرا کوئی ثانی

ترے ایمائے کُن سے ہے ظہورِ عالمِ امکاں
ترے انوار سے صبحِ ازل کی جلوہ افشانی

طفیلؔ بے نوا کی ہر نوا میں نام ہے تیرا
تری حمد و ثنا ہے اس کا موضوعِ سخندانی

نعت رسول مقبول ﷺ

اخترؔ آنولوی

تسکینِ روح کلمہ طیب کا جام ہے
بعدِ خدا لبوں پہ محمدؐ کا نام ہے

خوشبوئے بزم ذکرِ محمدؐ تو دیکھیے
ہر سانس عطر وردِ درود و سلام ہے

راز و نیاز جلوت و خلوت کا ہے ثبوت
محبوب کا کلام، محب کا کلام ہے

پاؤ گے چل کے سیرتِ حضرتؐ پہ مومنو!
ایسی حیات جس کو بقائے دوام ہے

دن کو بھی ان سے روشنی شب کو بھی روشنی
مہرِ تمام بھی ہے جو ماہِ تمام ہے

آئے ہیں پَر سمیٹ کے روح الامین بھی
اللہ کے حبیبؐ کا یہ احترام ہے

اخترؔ کہیں گے مجھ کو نکیرین* دیکھ کر
جائے ادب ہے دیکھو، نبیؐ کا غلام ہے

* نکیرین (منکر نکیر)

گھنٹے کی صدا

یہ ریت کی دنیا ہے عجب افسانہ
بت ریت کے ہیں، ریت کا ہے بت خانہ
گھنٹے کی صدا ریت کے اندر گم ہے
گویا کہ ہوئی صدا بھی اک ویرانہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اور یہ دنیا کی زندگانی تو محض کھیل تماشا ہے البتہ آخرت کے گھر کی
زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ کاش! یہ لوگ جانتے۔" (العنکبوت: ۶۴)

جب کسی انسان کے اندر تفکر کا پیٹرن بن جاتا ہے تو اس کے ہر عمل میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک عام آدمی ریت پر سے گزرتا ہوا چلا جاتا ہے لیکن جس آدمی کے اندر تفکر ہوتا ہے، وہ ریت کے اندر چمکدار ذرّات پر غور کرتا ہے اور ریت کی روپہلی چمک اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ انسان کی طرح ریت کا ہر ذرّہ بھی جان دار ہے، پُرکشش ہے اور انسان سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

ریت کے یہ سارے ذرّات اپنی چمک دمک سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہماری بھی ایک دنیا ہے اور یہ دنیا بھی انسان کی طرح ایک افسانہ ہے۔ ریت کے ذرّے بولتے ہیں ــــ ہم فنا کے مراحل میں ہیں۔ ایک وقت تھا، بہت بلند اور ارفع و اعلیٰ سرسبز و شاداب پہاڑوں پر ہمارا حجم منوں اور ٹنوں کے حساب سے تھا۔ وہاں سے ایک ذرّہ جو کئی کئی ہزار ٹن وزنی تھا، اپنے قبیلے سے، اپنے ماحول سے، اپنی جنم دھرتی سے الگ ہوا اور پانی کے طوفانی ریلوں نے اسے وہاں سے لڑھکا دیا۔ وہاں سے لڑھکتے لڑھکتے، ٹوٹتے ٹوٹتے، ریزہ ریزہ ہوتے ہوتے ہزاروں میل کی صعوبتیں برداشت کر کے سمندر میں آ گرا۔

اے انسان! تو جو ریت کا ایک ذرّہ دیکھ رہا ہے، یہ دراصل اپنی اصل میں ایک پہاڑ ہے جو ٹوٹ کر، بکھر بکھر کر ریت کے ذرّات میں تبدیل ہو گیا۔ یہ ریت کیا ہے؟ مٹی ہے۔ یہی وہ مٹی ہے جو کبھی پہاڑ بن جاتی ہے، یہی وہ مٹی ہے جو کبھی چٹان بن جاتی ہے۔ یہی وہ مٹی ہے جو کبھی محراب و منبر اور بت خانہ بن جاتی ہے۔ جب بت، بت خانہ اور محراب و منبر ٹوٹ کر بکھرتے ہیں تو ریت سے ذرّات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ گھنٹے کی صدا ہو، ناقوس کی آواز ہو یا آدم کی اذان ہو، سب ریت کے ایک گھروندے پر قائم ہیں۔ ریت کے اس گھروندے میں کوئی ہستی چھپی ہوئی بیٹھی ہے۔ ہستی کا "ادراک" ہو جائے تو دنیا ہے۔ ہستی کا ادراک نہ ہو تو ہر چیز ریت کے اندر گم ہے گویا گھنٹے کی صدا، بت، بت خانہ، سب ویرانہ ہے۔

آج کی بات

آدمی چلتا ہے تو ذہن کی مناسبت سے زمین اور قدموں کے درمیان ترتیب قائم ہوتی ہے — وہ زمین کی رفتار کو اپنی شعوری سطح کے مطابق محسوس کرتا ہے۔ چلتے ہوئے توجہ اس طرف نہیں جاتی کہ اسپیس تقسیم ہو رہی ہے لیکن اسپیس تقسیم ہوتی ہے۔ اسپیس کی تقسیم کے بغیر وہ سفر نہیں کرتا۔ ایک قدم لیتا ہے پھر دوسرا قدم۔ دو قدموں کے درمیان فاصلہ آدمی کا سفر ہے۔ وہ سفر کو وقت اور فاصلے کی طرزوں میں بیان کرتا ہے — فاصلے میں سفر کرتا ہے اور اسے وقت کا نام دیتا ہے جب کہ وقت فاصلہ نہیں ہے۔ وقت میں قربت ہے۔ یہ اسپیس کی کارفرمائی ہے جو آدمی کو فاصلوں میں الجھا کر فریب پیدا کرتی ہے کہ تم نے اتنا وقت طے کر لیا۔ وقت کہاں طے ہوا —؟ وہ تو اسپیس کی بھول بھلیّوں میں گم ہو گیا۔

اسپیس کیا ہے —؟ وجود رکھنے والی ہر شے اسپیس ہے۔ اسپیس کی تعریف پر تفکر سے انکشاف ہوتا ہے کہ خالی نظر آنے والی جگہ بھی اسپیس کے علاوہ کچھ نہیں اس لئے خالی نظر آتی ہے۔ اسپیس ایسا ڈائی مینشن ہے جو خالی پن* کو دوری کی شکل دے کر اس کے گرد خول بنا لیتا ہے۔ آدمی خول کے دھوکے میں آکر اسے طرح طرح کے نام دیتا ہے جب کہ خول اندر سے خالی ہے*۔ یہ سب اسپیس کی کارفرمائی ہے۔

بیان کرنے کی دوسری طرز یہ ہے کہ محدود ذہن کی اسپیس تقسیم اور دوری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو جگہ تقسیم نظر نہیں آتی، وہ اسے خالی سمجھتا ہے اور جس جگہ کو ٹکڑوں میں

---

* خالی پن (جس کے ہونے کو ہم نہ ہونا سمجھ رہے ہیں۔)

* خول اندر سے خالی ہے، سے مراد خول کی اپنی کوئی حرکت نہیں۔ یہ دوری ظاہر کرنے کا میڈیم ہے۔

بٹا ہوا دیکھتا ہے، اسے کوئی نام دے دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آدمی زندگی کو تقسیم کی طرز (پیٹرن) پر گزارتا ہے۔ گھڑی میں سوئیاں غائب کر دیں، وقت موجود رہتا ہے لیکن آدمی کے طرزِ بیان سے باہر ہے۔ وقت کی موجودگی اس طرح ہے کہ گھڑی کی سوئی چلے نہ چلے، زندگی جہاں سے آئی ہے، اس جانب رواں ہے۔

• • ——————— • •

اسپیس کی تقسیم کی ایک مثال رات دن کا ادل بدل ہے۔ اللہ رات کو دن اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔ رات میں سے دن اور دن میں سے رات کو نکالتا ہے، اور جسے چاہتا ہے، timelessness سے واقف کرا دیتا ہے۔ خالقِ لیل و نہار اللہ کا ارشاد ہے،

"اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق* عطا کرتا ہے۔" (اٰلِ عمرٰن: ۲۷)

رات اور دن کے آنے جانے میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

غور کیجئے، فہم کے پٹ کھولئے۔ رات میں سے دن نکلتا ہے تو کیا دن رات سے الگ ہے—؟ جب دن میں سے رات ظاہر ہوتی ہے تو کیا رات دن سے الگ ہوئی—؟ رات اور دن کو منور کرنے والی روشنی ایک ہے۔ جب آدمی اسے محدود طرزوں میں دیکھتا ہے تو دن بن جاتی ہے اور جب غیر محدود طرزیں نظر بنتی ہیں تو اس کا نام رات ہو جاتا ہے۔

رات اور دن کیا ہے—؟

افق پر نظر دوڑائیے۔ ہم سورج سے دور ہوتے ہیں تو کہتے ہیں — رات ہو گئی۔ سورج کے نسبتاً قریب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں — دن نکل آیا۔ ہم ایسی قرب و بُعد میں زندگی جی رہے ہیں جس کے معانی اسی زمین پر رہنے والے دوسرے فرد کے لئے مختلف ہیں۔

---

* رزق (وسائل۔ وسائل میں علم شامل ہے۔)

دونوں کا مشاہدہ الگ ہے اور دونوں درست نہیں اس لئے کہ ہم اندر میں دیکھنے کو نہیں دیکھ رہے ـــ زمین کے سورج سے دور ہونے کو دیکھ رہے ہیں، زمین کے سورج سے قریب ہونے کو دیکھ رہے ہیں۔ سورج کو روشنی کہاں سے ملتی ہے ـــ اس طرف ذہن نہیں جاتا۔ غروب ہوتا سورج روز پیغام دیتا ہے کہ مجھے دیکھ کر تم دھوکے میں مبتلا رہے کہ میں روشن ہوں۔ اگر سورج روشن ہے اور اس روشنی میں تپش ہے تو شام کو اس پر نظر کیسے ٹھہرتی ہے ـــ؟ اور دن میں اسے چند منٹ دیکھنے پر بینائی متاثر ہو جاتی ہے۔

آدمی سورج کو دیکھتا ہے، اس کے گرد زمین کی گردش کے زاویوں کو نہیں دیکھتا۔ زمین کا وہ حصہ جہاں ہم رہتے ہیں، سورج سے دور ہوتا ہے تو سورج میں محسوس ہونے والی تپش اور چمک کہاں چلی جاتی ہے ؟ کیا اس سے ظاہر نہیں ہے کہ سورج روشن نہیں ہے، زمین روشن ہے ـــ؟ زمین جس زاویے سے سورج کے سامنے آتی ہے، اس کی روشنی سورج کی اسکرین سے منعکس ہو کر واپس زمین کی طرف آتی ہے اور جیسے جیسے زمین کا وہ حصہ جہاں ہم یا کوئی رہتا ہے، سورج سے دور ہوتا ہے، اُس خطۂ زمین کے لئے سورج سے انعکاس کا عمل نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ زمین کا جو حصہ سورج سے قریب ہے، وہ ہمارے لئے دن ہے۔ جو حصہ سورج سے دور ہے، اس کو رات سمجھ لیا جاتا ہے۔ اندر میں نگاہ دیکھتی ہے کہ سورج روشن نہیں ہے، زمین روشن ہے جو سورج کو منور دکھاتی ہے۔ یہ سب کیا ہے ؟ زاویوں کی تقسیم ہے یا تقسیم کا زاویہ ہے جو نظر بن کر منظر بن رہا ہے ؟

• • ——————— • •

قارئین ! ایک وہ اسپیس ہے جو قدرت نے تخلیق کی ہے اور ایک اسپیس نافرمان ذہن کا فریب ہے۔ اللہ تعالیٰ آخری آسمانی کتاب قرآن کریم میں فرماتے ہیں،

"اور تم پر جو مصیبت آتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے آتی ہے اور اللہ بہت سے گناہ معاف کر دیتا ہے۔" (الشوریٰ : ۳۰)

آدمی قدرت کی اسپیس کو نظر انداز کر کے اس اسپیس میں زندگی گزار رہا ہے جس میں دوری ہے — تقسیم ہے — فاصلے ہیں۔ قدرت کی اسپیس کیا ہے —؟ اس کا ایک مظاہرہ جنت کی دنیا ہے جہاں وسائل لاشمار ہیں لیکن اسپیس کی تقسیم کا خیال مغلوب ہے۔ جنت میں غالب اسپیس درخت کو درخت، پھول کو پھول، نہروں کو نہریں اور آسائشوں کو آسائش دکھاتی ہے لیکن ان کو دیکھ کر ذہن تقسیم نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ جنت میں ذہن اس ''ہستی'' میں یکسو ہے جو یکتا ہے۔ جنت کے مکینوں کا زاویۂ نگاہ اللہ کا حکم، فرماں برداری اور اللہ سے قرب کا احساس ہے جس نے ہمیں اور ہماری ضرورت کے لئے وسائل پیدا کئے ہیں۔ زمین پر آدمی کی مرکزیت وسائل ہیں اس لئے ذہن بٹا ہوا ہے۔

زاویے کیسے بنتے ہیں —؟ ذہن میں شے کی اہمیت ہے تو ہر شے زاویہ ہے۔ اس شے کو اہم سمجھنا بھی زاویہ ہے جس کے تناظر میں اسے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح لاتعداد زاویے بنتے ہیں۔ جب فرد تخلیق کرنے والی ہستی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو چیزیں موجود رہتی ہیں لیکن الوژن کے زاویے ٹوٹ جاتے ہیں اور ایک خیال غالب رہتا ہے جو اللہ کا ہے۔

> '' یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو۔ قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ یہی راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' (الروم : ۳۰)

قابلِ قدر خواتین و حضرات، ''آج کی بات'' بحرِ رواں ہے جس میں سچے موتی ہیں۔ موج در موج اٹھنے والے خیالات اور خیالات کی تہ میں عیاں نہاں — نہاں عیاں رموز آپ کی نذر ہیں۔

اللہ حافظ

خواجہ شمس الدین عظیمی

فقیر کی ڈاک

تفکر — ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ تفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی — عرفانِ نفس اور معرفتِ الٰہی ہے۔ ”فقیر کی ڈاک“ اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحبؒ نے شعور کے تانے بانے کو لاشعور سے جوڑ دیا ہے۔

محترم و مکرم عظیمی صاحب — السلام علیکم و رحمۃ اللہ،

خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان ہماری بہترین تخلیق ہے لیکن یہ اسفل سافلین میں پڑا ہوا ہے۔ راہ نمائی فرمایئے کہ اسفل میں گرا ہوا شخص زندگی کس طرح گزارے کہ جنت کا دائمی سکون حاصل ہو اور وہ اسفل زندگی سے نکل کر اعلیٰ مقام پر فائز ہو جائے۔

نیاز مند، عبداللہ

وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ،

آسمانی کتابوں کے مطابق سکون حاصل کرنے کا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انسان غصہ نہ کرے اور کسی بات پر پیچ و تاب نہ کھائے۔ عملی زندگی میں کوتاہی نہ کرے اور نتیجے کے اوپر نظر نہ رکھے۔ زمین پر بسنے والی قومیں زندگی کے جن اصولوں پر کاربند ہیں، اُن کا مطالعہ کرے۔

قانونِ فطرت میں کہیں جھول نہیں ہے۔ ہر چیز وقت کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ وقت جس طرح سے چابی بھر دیتا ہے، شے حرکت کرنے لگتی ہے۔ وقت اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے تو کھلونے میں چابی ختم ہو جاتی ہے۔ کَل پرزے سب ہوتے ہیں لیکن قوت (Energy) نہیں رہتی۔

وقت قوت کا مظاہرہ ہے۔ قوت ایک توانائی ہے، ایک مرکز ہے اور اسی مرکز کو آسمانی کتابیں قدرت

کے نام سے متعارف کراتی ہیں۔ قدرت ایسا مرکزی نقطہ ہے جس نقطہ کے ساتھ پوری کائنات کے افراد بندھے ہوئے ہیں— وجود اور عدم وجود دونوں اس میں گم ہیں۔ انسان جب کائنات کے مرکزی نقطہ سے اپنا رشتہ تلاش کرلیتا ہے اور خالقِ کائنات کو جان لیتا ہے تو دنیا سے اُس کی ساری توقعات ختم ہو جاتی ہیں اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو مسرّتیں اس کے گرد طواف کرتی ہیں اور موت کی آنکھ اُسے مامتا سے دیکھتی ہے۔ ملک الموت اُس کے قریب آنے سے پہلے دستک دیتا ہے اور اجازت کا طلب گار ہوتا ہے۔

حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کے حالات میں مذکور ہے کہ حالتِ نزع سے پہلے ایک بزرگ نے دروازے پر دستک دی۔ بڑے صاحبزادے باہر گئے تو ایک بزرگ نے انہیں لفافہ دیا اور کہا کہ اپنے والد صاحب کو دے دیں۔ حضرت زکریا ملتانیؒ نے خط پڑھا اور تکیے کے نیچے رکھ دیا اور صاحبزادے سے فرمایا کہ باہر جا کر کہو، آدھے گھنٹے کے بعد آئیں۔ اُس کے بعد انہوں نے لوگوں کی امانتیں واپس کیں، وضو کر کے نوافل ادا کئے اور دعا کر کے بستر پر لیٹ گئے— روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

تدفین کے بعد صاحبزادے کو خیال آیا کہ وہ بزرگ کون تھے جنہیں والد محترم نے آدھے گھنٹے کے بعد بلایا تھا۔ تکیے کے نیچے سے لفافہ اٹھا کر دیکھا تو اس کے اندر پرچے پر یہ تحریر لکھی ہوئی تھی،

"بڑی سرکار سے آپ کا بلاوا آیا ہے۔ میں حاضر ہوں، میرے لئے کیا حکم ہے؟"

(عزرائیل ملک الموت)

کہا جاتا ہے کہ ٹھیک آدھ گھنٹے کے بعد حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ عالمِ اسفل سے عالمِ اعلیٰ میں تشریف لے گئے۔

کوئی شخص ان باتوں پر صدقِ دل سے عمل کرلے تو وہ موت سے آشنا ہو کر جنت کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔ ① بات ہمیشہ سچی کرے۔ ② وعدہ خلافی نہ کرے۔ ③ امانت میں خیانت نہ کرے۔ ④ آنکھوں کو نظر بازی سے دور رکھے۔ ⑤ کسی پر ظلم نہ کرے۔ ⑥ مخلوق کی خدمت کرے ...اور ⑦ اسلام میں پورا پورا داخل ہو جائے۔

دعا گو، عظیمی

نامے میرے نام

"ماہنامہ قلندر شعور" نے قارئین خواتین و حضرات کو رسالے کے پلیٹ فارم سے تفکر کی دعوت دی ہے۔ رابطے کے قدیم و جدید وسائل کے ذریعے موصول ہونے والے خطوط شائع کئے جارہے ہیں۔

اپریل 2025ء کے "آج کی بات" پر موصول تفکر نامے میں سے منتخب خطوط:

◇ صدف مبین (برلن۔ جرمنی): اپریل 2025ء کا "آج کی بات" آن لائن پڑھا۔ خلا جس میں ہماری تخلیق ہوئی ہے، اس کا خالی پن میرے اندر نمایاں ہوگیا اور آنسو بہتے رہے لیکن جب تفکر میں محو ہوئی تو جس ہستی کے ذہن سے یہ رموز ظاہر ہوئے ہیں، ان کی موجودگی کا احساس ہوا۔ جب تک غور و فکر میں رہی، بھول گئی کہ 21 فروری 2025ء کا دن بھی گزرا ہے۔ ہدایت کے مطابق آنکھیں بند کرکے اندر میں اسکرین کو دیکھا تو مرکزی مراقبہ ہال، کراچی کے رنگ رنگ پھول، پودوں اور پُرسکون فضا کا نقشہ ابھرا اور مرشد کریم محترم عظیمی صاحبؒ کا مسکراتا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اداریے میں لکھے ہوئے قانون پر غور و فکر کے دوران یہ جملہ ذہن میں آیا، دو پرتوں کے ملنے سے ظاہر ہونے والے خلا کا نام آدمی، حیوان، پھول، پودے وغیرہ ہے۔

◇ بی بی مریم (کراچی): حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحبؒ کی تحریریں مکانیت کی قید سے آزاد ہیں اس لئے اداریے کا عنوان "آج کی بات" ہے۔ اپریل 2025ء کے "آج کی بات" کا پہلا پیراگراف پوری تحریر کا خلاصہ ہے۔ میں یہ سمجھی ہوں کہ غور و فکر اسکرین ہے جس میں دلچسپی اور رجحان کے مطابق تصویریں ظاہر ہوتی ہیں اور یہ تصویریں طرز فکر کو ظاہر کرنے کا پروجیکٹر ہیں۔ لکھا ہے، "ہر شے تصویر میں ظاہر ہوتی ہے اور تصویر الگ الگ رنگوں کی یکجائی ہے۔" ان الفاظ میں دو پرت، دو پرت کے درمیان اسپیس یعنی خلا اور دونوں پرت میں خلا کا مفہوم موجود ہے۔

◇ محمد عاصم (حیدرآباد): رنگ طرز فکر ہے جو حقیقت سے دوری یا قربت کو ظاہر کرتا ہے۔

◇ مشتاق حیدر (راولپنڈی): تخلیق کی ایکویشن رنگوں کی الگ الگ فریکوئنسی پر قائم ہے۔ ہر رنگ ایک فریکوئنسی ہے۔ کسی رنگ کی فریکوئنسی سے واقف ہونا، اس رنگ کی اصل تک پہنچنا ہے۔

◇ صوفیہ (برمنگھم): ''آج کی بات'' پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ زندگی رنگوں سے معمور ہے۔ رنگوں میں کشش محسوس ہوتی ہے تو ہم انہیں رنگ کہتے ہیں۔ کشش نہ رہے تو ان رنگوں کو بے رنگ دیکھتے ہیں۔ جب ذہن رنگوں میں کشش محسوس نہیں کرتا تو اس رنگ میں داخل ہو جاتا ہے جس کو بے رنگی کہتے ہیں۔ بے رنگی بدلتے ہوئے رنگوں کی گرفت یا کشش سے آزاد ہونا ہے۔

◇ ساجد الیاس (میاں چنوں۔ خانیوال): رنگ دوری ہے اور دوری فریب ہے۔ فریب حقیقت نہیں ہے اس لئے بدلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے،

''کہو، اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اللہ کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہے۔
ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔'' (البقرۃ: ۱۳۸)

◇ ڈاکٹر ندا تبسم (لاہور): دو رنگوں میں سے جب تیسرا رنگ نکلتا ہے تو اس کی حیثیت الوژن ہے کیوں کہ تیسرا رنگ ایک رنگ نظر آتا ہے لیکن دو سے بنا ہے۔ مثلاً بنفشی رنگ سرخ اور نیلے رنگ کی مقداروں کے ایک ہونے پر نظر آتا ہے۔ سرخ، نیلا اور پیلا پرائمری رنگ میں شمار ہوتے ہیں۔ محققین کا قیاس ہے کہ یہ کسی رنگ سے مل کر نہیں بنے بلکہ ان کے ملنے سے دوسرے رنگ بنتے ہیں۔ قانونِ قدرت کے مطابق ہر تخلیق دو سے مل کر بنی ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ پرائمری رنگوں کی بھی کوئی اساس (base) ہے جس سے دنیا ابھی واقف نہیں۔

◇ گلِ نسرین (کراچی): جتنے رنگ ہیں، سب کی بنیاد سفید ہے — رنگ اپنے پیچھے سفید رنگ ہونے کی وجہ سے ہمیں نظر آتے ہیں۔ سفید کی خاصیت ہے کہ اپنی شناخت قائم رکھتے ہوئے ہر رنگ کو منعکس کرتا ہے۔ اگر سفید پر نیلا رنگ ہونے سے سفید رنگ ختم ہو جائے تو نیلا بھی نظر نہیں آئے گا۔ نیلے رنگ کے وجود کی وجہ سفید رنگ کا اپنی جگہ موجود ہونا ہے۔

◇ علی عمران (ملتان): اداریے کے آخر میں لکھا ہے، ''آپ نے 'آج کی بات' پڑھی۔ میری آواز

میں سن کر پڑھی"۔ اس میں شک نہیں کہ محترم عظیمی صاحبؒ کی کوئی تحریر جب ہم پڑھتے ہیں تو اسے ان کی آواز میں سنتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ الفاظ کے ساتھ آواز بھی ریکارڈ ہو جاتی ہے اور فرد غیر ارادی طور پر شعور کی گہرائی میں اتر کر اسے سنتا ہے۔

اپریل 2025ء کے مضامین پر قارئین کی آرا اور تبصرے:

◈ انعم افروز (پشاور): منقبت "قلندروں کا ہم سفر" کے الفاظ میں محبت اور محبت میں درد سے ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑے جوڑنا مشکل ہو گیا۔ "نامے میرے نام"، "فقیر کی ڈاک" اور رسالے کے مضامین سب میں حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ کی عظمت کا اظہار ہے۔

◈ شمائلہ کوثر (لاہور): اپریل 2025ء کے شمارے کا شدت سے انتظار تھا۔ نم آنکھوں سے رسالہ کھولا۔ سب سے زیادہ خوشی "آج کی بات" دیکھ کر ہوئی۔ میں نے اسے پڑھا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے اسے پڑھا لیکن اندر میں مرشد کریم کی آواز میں سنا۔ پھر "فقیر کی ڈاک" نے رلا دیا۔ مضامین میں جہاں درد کی کیفیت ہے، وہاں سلسلۂ عظیمیہ کے مشن کو آگے بڑھانے کا عزم ہے۔ اگرچہ رسالہ پڑھتے ہوئے روتی رہی لیکن مضامین کے معیار پر خوشی ہوئی۔ بلاشبہ مرشد کریم کی دن رات محنت اور تربیت کی وجہ سے "ماہنامہ قلندر شعور" علم کا "باادب بانصیب" ذخیرہ ہے۔

◈ انجینئر دانش حفیظ (کراچی): کلاس "احسان و تصوف" کی ایک طالبہ کا "السلام علیک و رحمۃ اللہ" کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ مضمون کی نوعیت اور فہم میں وسعت و گہرائی سے اس کلاس کی فکری پرواز کا اندازہ ہوا۔ معین مقداروں اور مقناطیسی میدان (magnetic field) کو منفرد طرز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ طالبہ کون ہیں جنہوں نے اعلیٰ پائے کی تحریر لکھ کر اپنے استاد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے—؟ نام نہیں لکھا۔ مضمون پڑھ کر پہلا خیال یہ آیا کہ بے شک محترم عظیمی صاحبؒ نے "علم کے چراغ جلا دیے ہیں، روشنی پھیلتی رہے گی"۔

◈ شہریار فاروق (ابوظہبی): سندس بشیر نے مضمون "سفید سمندر" میں یہ لکھ کر کہ "سمندر کے کنارے سطح پر نہیں، گہرائی میں ہیں— سطح محض پھیلاؤ ہے۔" سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔

◈ حمزہ (اسلام آباد): اپریل 2025ء کا شمارہ یادگار ہے۔ سرورق سے لے کر آخری صفحے تک رسالہ عمدہ ہے۔ ”قصہ دردِ دل“ اور ”میں نے کیا سنا؟“ نے جذبات کی ترجمانی کی۔ ”خیر کی فریکوئنسی“، ”السلام علیک ورحمۃ اللہ“، ”بروج کے راستے“ اور ”فہم کا جغرافیہ“ متاثر کن ہیں۔ فہم کا بھی جغرافیہ ہے، یہ بات میرے لئے نئی تھی۔ عنوان دلچسپ اور اچھا لگا۔ ”آپ کے خواب اور ان کی تعبیر“ میں سے کوپن ہٹ گیا — یہ اچھا نہیں لگا۔

◈ یاسمین گل (فیصل آباد): اپریل کا شمارہ یادوں کے پھولوں سے مہک رہا ہے۔ سب دردِ دل بیان کرتے نظر آئے۔ صفحہ 67 پر 27 جنوری 2023ء کے اباجی کے خطاب میں سے اقتباس درج ہے،

> ”شجر کا مطلب یہ ہے کہ پتّوں میں پتّے، شاخ در شاخ اور پھل۔ یہ وہ سوچ ہے جس میں illusion ہے۔ ابھی درخت بھرا ہوا ہے آموں سے اور اب ایک بھی نہیں ہے۔ پھر بھر گیا پھر خالی ہے۔ یہ reality ہے یا illusion ہے — ؟“

جواب یہ ہے کہ درخت کا آموں سے لدا ہونا اور پھر خالی ہونا تغیر ہے۔ حقیقت سے دور فہم سے جب دیکھا جاتا ہے تو شے میں گھٹنا بڑھنا نظر آتا ہے۔ یہ دیکھنا الوژن ہے۔

◈ آسیہ فہد (اسلام آباد): ”ماہنامہ قلندر شعور“ پڑھنے سے ذہنی انتشار ختم ہوتا ہے جیسے میں ایک اسپیس سے نکل کر دوسری اسپیس میں چلی گئی ہوں۔ دن پُرسکون گزرتا ہے۔ اندر میں توانائی محسوس ہوتی ہے اور میں خود سے کہتی ہوں کہ سب کچھ گزر جانے کے لئے ہے۔

◈ نعمان ملک (دبئی): بی بی انورادھا کی تحریر ”Until We Meet Again“ ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھی۔ انگریزی حصے میں مضامین کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے۔

آپ کا ہر دلعزیز رسالہ ”ماہنامہ قلندر شعور“ آن لائن مطالعے کے لئے دستیاب ہے۔ ”ماہنامہ قلندر شعور“ کے ڈیجیٹل ایڈیشن کی سبسکرپشن کے لئے ویب سائٹ پر موجود فارم پُر کیجئے۔ ہمارا ویب ایڈریس یہ ہے،

https://qalandarshaoormonthly.online/

زیرِ سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

عظیمیہ روحانی لائبریری

برائے خواتین

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات، راہِ سلوک کے مسافر اور ــــ
روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے طالبات و طلبہ کے لئے عظیمی صاحبؒ
کی کُتب اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

مکان نمبر 65 بلاک A-2، پنجاب ہاؤسنگ سوسائٹی
نزد جوہر ٹاؤن، لاہور۔ فون نمبر: 042-35185142

شرح نظریۂ رنگ ونور

اللہ کے دوست، خاتم النبیین حضرت محمدؐ کے عاشقِ صادق، ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ کے شاگردِ رشید اور خانوادہ، صاحبِ نظامِ تکوین، لوح وقلم کے امین، حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ کی ذاتِ بابرکات اور صفات سے مخلوقات بشمول انسان وجنات نے فیض پایا ہے — فیضان جاری ہے۔

خانوادہ سلسلۂ عظیمیہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ نے تحریر وتقریر کے ذریعے عوام الناس کی تربیت کی۔ خوف وغم سے آزاد کرکے اللہ کا دوست بننے، نظامِ کائنات سے واقف ہونے اور ''اندر میں'' مشاہدے کے لئے تفکر کی طرز بیدار کی اور روحانی وسائنسی طرزوں پر کائناتی رموز کی تشریح کی۔

اس سلسلے کی ایک کڑی 26 جولائی 2009ء کو عظیمیہ جامع مسجد کراچی میں کلاس ''نظریۂ رنگ ونور'' کا انعقاد ہے جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے منسلک خواتین وحضرات شریک ہوئے۔ اس کلاس میں کتاب ''نظریۂ رنگ ونور'' کے بعد چار کتابیں بالترتیب ''تذکرہ قلندر بابا اولیاؒ''، ''رنگ اور روشنی سے علاج''، ''روحانی علاج'' اور ''احسان وتصوف'' پڑھائی گئیں اور لیکچرز دیے گئے۔

مرشد کریم نے 2024ء کی ابتدا میں ان لیکچرز کو رسالہ ''ماہنامہ قلندر شعور'' میں شائع کرنے کا فیصلہ کرکے مضامین کی طرز پر ترتیب دینے کے لئے کام کا آغاز کیا۔ انہوں نے اکتوبر 2024ء میں عنوانات منتخب کئے اور پہلی کتاب کے لیکچرز کو ''شرح نظریۂ رنگ ونور'' کا عنوان دیا۔ مرشد کریم ''اباجی'' کی خواہش رہی ہے کہ قارئین خواتین وحضرات ان لیکچرز کو باطنی علوم کے طالب علم کی حیثیت سے پڑھیں، ان میں تفکر کریں، جو سمجھ میں آیا اور سمجھ میں نہیں آیا، ڈائری میں نوٹ کرلیں۔

صاحبِ حق الیقین مرشد کریم محترم عظیمی صاحبؒ کا ورثہ علم ہے، وہ علم جسے حاصل کرکے انسان اللہ کا دوست بنتا ہے اور فی الارضِ خلیفہ کے منصب پر فائز ہوجاتا ہے۔ حضور اباجی کی ہدایت کے مطابق پندرہ سالوں پر مشتمل یہ لیکچرز ترتیب وار ''ماہنامہ قلندر شعور'' کے قارئین کے لئے پیشِ خدمت ہیں۔

(ادارہ — ماہنامہ قلندر شعور)

غصے کی لہریں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقرا باسم ربك الذی خلق○

خلق الانسان من علق○

اقرا وربك الاکرم ○ الذی علم بالقلم○

علم الانسان مالم یعلم○

یہ قرآن کریم کی ابتدائی آیات ہیں جو وحی کے ذریعے خاتم النبیین حضرت محمدؐ پر نازل ہوئیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلا حکم "پڑھنے" کا دیا گیا ہے۔ حضور پاکؐ نے دو دفعہ فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے شروعات اس سے کی،

"پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تخلیق کیا انسان کو خون کی پھٹکی سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ سکھایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا۔" (العلق:۱۔۵)

بہت غور طلب ہے کہ قرآن کریم کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے پہلا حکم پڑھنے کا دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو پڑھا ہوا نہیں ہوتا۔ اس کو اسکول، کالج یا استاد کے ذریعے پڑھایا جاتا ہے۔ یہی صورت ہماری ہے۔ ہم پیدا ہوتے ہیں تو زبان بولنا نہیں آتی۔ جیسے جیسے الفاظ کان میں جاتے ہیں، بار بار سنتے ہیں تو بولنے لگتے ہیں اور زبان بولنی آجاتی ہے۔

پہلی بات جو بہت غور طلب ہے، وہ یہ کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ پڑھا ہوا نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے زبان سیکھتا ہے۔ ماں باپ اور خاندان کے افراد کی گفتگو سن کر نقل کرتا ہے۔ توتلی زبان میں ٹوٹے پھوٹے لفظ بولتا ہے اور بتدریج مشق سے لفظوں کی درست ادائیگی کرتا ہے۔ اس طرح زبان بولنی آجاتی ہے۔

پڑھنے کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اسکول جاتا ہے اور اساتذہ پڑھاتے ہیں لیکن اسکول جانے کا مرحلہ تین سال بعد کا ہے۔

اصل بول چال ماں باپ اور خاندان کی گفتگو ہوتی ہے، بچہ اس کو سن کر نقل کرتا ہے اور بالآخر مادری زبان سیکھ جاتا ہے۔

مادری زبان سیکھنے میں قاعدے، قلم اور استاد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گھر کے ماحول میں ماں باپ بولتے ہیں، بہن بھائی گفتگو کرتے ہیں، آنے جانے والے لوگ تبادلۂ خیال کرتے ہیں، وہ بچے سنتے رہتے ہیں — اور بچے جو سنتے ہیں، ٹوٹی پھوٹی زبان میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں نقل کرتے ہیں اور نقل کے بعد چھوٹے چھوٹے جملے بڑے بڑے جملوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں — بچوں کو ماحول فراہم کیا جاتا ہے۔

انگریز اپنے بچوں کو جو ماحول فراہم کرتے ہیں، اس میں بولی جانے والی زبان انگلش ہے۔ پاکستان میں اردو زبان اور مختلف زبانیں ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ والدین کی جو زبان ہے، وہی بچے سیکھتے ہیں اور اسے سیکھنے کے لئے کاپی، قلم اور کاغذ کی ضرورت نہیں ہے۔

تمہید کا مطلب یہ ہوا کہ زبان سیکھنے اور اظہارِ خیال کے لئے پڑھنا لکھنا ضروری نہیں ہے۔ کسی گھر میں بہترین اردو بولی جاتی ہے تو بچے وہی اردو بولیں گے۔ کسی گھر میں مکس اردو، فارسی، پنجابی بولی جاتی ہے تو بچے وہی بولیں گے۔ بچوں کو بات چیت کے طریقے سکھائے نہیں جاتے۔ وہ جو کچھ سنتا ہے، وہی بولنے لگتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب کوئی بچہ زمین پر آتا ہے تو اس کا جو ذہن ہوتا ہے پیدائشی، وہ صفر ہوتا ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ نہ یہ کہ میں کس کی اولاد ہوں، میری ماں کون ہے، باپ کون ہے، بھائی کون ہے۔ میری زبان کیا ہے۔

زبان کا معاملہ ماحول کے زیرِ اثر ہے۔ ماحول میں جس طرح کھانا کھایا جا رہا ہے، بچہ اس طرح کھانا شروع کر دیتا ہے مثلاً کچھ لوگ گولے بنا کے ایسے منہ میں پھینک کے کھاتے ہیں۔ کچھ لوگ لقمہ بنا کے کھاتے ہیں۔ کیا مطلب ہوا اس کا —؟ بچے جس ماحول میں رہتے ہیں، اس کی نقل کرتے ہیں۔ ماحول میں لڑائی، دنگا فساد ہو، وہ بچوں کے اندر بھی آجاتا ہے۔ بچے غصہ بھی کرتے ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ بچہ جب پیدا ہوا تو وہ اس قابل نہیں تھا کہ غصہ کرے لیکن جب وہ ماحول میں زندگی گزارتا ہے تو جو کچھ ہوتا ہے، اس کی نقل کرتا ہے۔ کیا مطلب ہوا —؟

کوئی چیز آپ کو سیکھنی ہو، کتاب، قلم، کاپی کے ذریعے سیکھنی ہو — یا کتاب، کاپی، قلم کے بغیر سیکھنی ہو، سب نقل ہے — سب نقل ہے۔

ماں باپ اگر ضدی ہوتے ہیں تو بچہ ضدی ہوتا ہے لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ ماں باپ بچے کی ضد کو پسند نہیں کرتے جب کہ بچے نے ضد کہاں سے سیکھی —؟ آپ کا یہی جواب ہو گا کہ ہمارے اندر چوں کہ ضد ہے اس لئے بچہ ضد کرتا ہے۔ ماں، باپ، خالہ، نانی، دادی جو بھی ہیں، سب ہاں بولتے ہیں۔ بچہ ہاں بولتا ہے تو ماں باپ کو برا لگتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ بچے نے ہاں کہاں سے بولا؟ اس کے اندر سے تو آواز تب ہی نکلے گی ناں، جب اس نے کچھ سنا ہو گا۔ تو بچے نے ہاں کہاں سے بولا؟ ماحول میں تو وہ ابھی گیا نہیں۔

ماں باپ ہاں بولتے ہیں تو بچہ ہاں بولتا ہے، ماں باپ جی بولتے ہیں تو بچہ بھی بولتا ہے۔ ماں باپ اندر سے کھولتے ہیں، غصہ کرتے ہیں۔ بچہ چوں کہ بلینک ہوتا ہے، وہ اٹھا کے تھپڑ مار دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ماں باپ کے اندر غصہ نہیں ہے تو بچے کو غصہ کیوں آیا؟ ماں باپ اگر گالی نہیں دیتے تو بچے نے گالی کیسے دی؟

بہت غور طلب بات ہے۔

آپ سب ماشاء اللہ بیٹھے ہیں۔ بچے نے گالی کہاں سے دی اور جب وہ گالی دیتا ہے تو اس کو زدوکوب کرتے ہیں، مارتے ہیں، سمجھاتے بھی ہیں۔ بچے نے گالی کیوں دی؟ ابھی تو وہ باہر نہیں نکلا۔ دو سال کا بچہ مارتا کیوں ہے؟ نوچتا کیوں ہے؟ کھسوٹتا کیوں ہے؟ باپ کے اور ماں کے تھپڑ کیوں مارتا ہے؟ کیوں مارتا ہے؟ ماں باپ اندر کھول رہے ہیں، غصہ کر رہے ہیں۔ بیوی شوہر کو مارنا چاہتی ہے لیکن معاشرے کے احترام کی بنیاد پر شوہر کو برا بھلا نہیں کہتی۔ شوہر بیوی کو گالی دینا چاہتا ہے۔

دو طریقے ہیں گالی دینے کے۔

ایک یہ کہ وہ زبان سے گالی دیتا ہے۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ دماغ میں گالی دیتا ہے۔

بات وہی ہے کہ بچے نے گالی کیوں دی؟ جب وہ بول نہیں سکتا تھا تو گالی کیوں نہیں دی؟ تیسری بات یہ ہے کہ بچہ وہی زبان کیوں بولتا ہے جو ماں باپ بول رہے ہیں؟ وہ فارسی، عربی، انگلش کیوں نہیں بولتا؟ والدین بچے کو بار بار، بار بار کپڑے نہ پہنائیں تو وہ کپڑے نہیں پہنے گا، پھینکتا رہے گا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو بلینک ہوتا ہے۔ اس کے دماغ میں جو سلیٹ ہے، اس پر کچھ نہیں لکھا ہوتا۔ ماں باپ جو کچھ اس پر لکھ دیتے ہیں، بچہ بولنے لگتا ہے۔ بچہ اسی طرح بیٹھتا اٹھتا ہے جس طرح ماں باپ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ بچے کا رویہ وہی ہوتا ہے جو ماں باپ کا ہوتا ہے۔ میاں بیوی لڑ رہے ہیں تو بچے بھی لڑیں گے لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ ماں باپ لڑتے ہیں اور بچہ نقل کرتا ہے تو وہ بچے کو مارتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کے ذہن میں لڑائی کہاں سے آئی جب کہ وہ ہر چیز نقل کرتا ہے؟

یہی صورت ماحول کی ہے۔ اچھا معاشرہ ہے، اچھا ماحول ہے۔ چھوٹے بچے اور بڑے بچے، آپ 60 سال کے ہو جائیں، ماں باپ کے لئے بچے ہیں۔ نقل ہے یہاں سب کچھ۔ ماحول میں اچھی باتیں ہیں تو ہم اچھی باتوں کی نقل کرتے ہیں۔ ماحول میں خراب باتیں ہیں تو ہم خراب باتوں کی نقل کرتے ہیں۔ ماحول میں بردباری ہے تو بچوں کے اندر بردباری آجاتی ہے۔ ماحول میں روحانیت ہے تو بچوں کے اندر بھی روحانیت آجائے گی۔ لامحالہ ایک ماحول بنے گا۔ حضور قلندر بابا اولیاؒ نے ”لوح و قلم“ میں فرمایا ہے،

”بچے کا ذہن آدھا والدین سے بنتا ہے
اور آدھا ماحول سے بنتا ہے۔“

اب ضروری ہے کہ اگر آپ کسی کو کچھ سکھانا چاہیں، اس کی تربیت کرنا چاہیں تو آپ کا ماحول اچھا ہونا چاہئے اور اخلاق بھی بہتر ہونا چاہئے۔ جیسے ماحول میں اگر گالم گلوچ ہے تو بچہ گالیاں دے گا۔ ماحول میں آپ جناب ہے، بچہ آپ جناب کہے گا، ماحول میں چھینا جھپٹی ہے تو بچہ بھی چھینا جھپٹی شروع کر دے گا۔

یہ دنیا عالمِ نقل ہے۔ یہاں ہر چیز نقل ہو رہی ہے۔ آپ انگریزی پڑھتے ہیں، انگریزی پڑھنے کا کیا مطلب ہے؟ نقل کرتے ہیں۔ اساتذہ ABCD پڑھاتے ہیں، بڑے بڑے جملے بولتے ہیں، آپ نقل کر لیتے ہیں۔ آپ تقریر کر رہے ہیں، وہ بھی نقل ہے۔ اس دنیا کی بنیاد نقل ہے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ یہاں نقل کرنے کا ماحول اچھا ہو جائے تو لوگ اچھے ہو جائیں گے اور نقل کرنے کا ماحول خراب ہے تو لوگوں کے اندر خرابی پیدا ہو جائے گی۔

ایک صورت یہ ہے کہ آپ ماحول کی نقل کر رہے ہیں۔ ایک وہ صورت ہے جو والدین کے اندر مخصوص ہے، آپ اس کی نقل کر رہے ہیں

اور ایک وہ صورت ہے جو استاد آپ کو کہہ رہا ہے، آپ اس کی نقل کر رہے ہیں۔ نقل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کا ذہن جس کی آپ نقل کر رہے ہیں، اس سے آپ کا ذہن وابستہ ہو۔ اس کو قبول کرتا ہو۔

جتنے علوم ہیں، وہ دراصل کیا ہیں؟ نقل ہیں۔ جتنے علوم آپ سیکھتے ہیں، اس کو ہم پڑھنا کہتے ہیں۔ صحیح لفظ ہونا چاہئے نقل کرنا۔ استاد کہتا ہے سی اے ٹی کیٹ (cat)۔ آپ کہتے ہیں ہم نے استاد سے پڑھا۔ صحیح طرزِ کلام یہ ہے کہ ہم نے استاد کی نقل کی۔ استاد نے کہا، بلی سفید ہے تو آپ کہیں گے بلی سفید ہے لیکن اس کو آپ نقل نہیں کہہ رہے — کہہ رہے ہیں پڑھا۔ ہم نے پڑھا کہ بلی سفید ہے۔ یہ بالواسطہ طرزِ کلام ہوا۔ بلاواسطہ یہ ہے کہ آپ نے نقل کی۔

اماں نے کہا اماں، بچے نے اماں کہہ دیا۔
اماں نے کہا بے بے۔ بچے نے بے بے کہہ دیا۔
آپ نے کہا پانی، بچے نے پانی کہہ دیا۔
دوسری ماں نے کہا واٹر، اس نے واٹر کہہ دیا۔
تیسری نے کہا جل، اس نے جل کہہ دیا۔
بچے کو پانی کا نہیں پتہ۔ وہ جل ہی کہے گا۔

لیکن غور طلب ہے کہ جو کچھ وہ بول رہا ہے، اس کے ذہن میں اس کے معنی و مفہوم ایک ہیں۔ وہ واٹر کہتا ہے جب بھی پانی۔ جل کہتا ہے جب بھی پانی۔ ”ماء“ کہتا ہے جب بھی پانی ہے۔ یہاں جو کچھ موجود ہے، دنیا میں اس کے لئے لفظ متعین ہے لیکن اس لفظ کے معنی ایک ہیں۔

بہت زیادہ غور طلب ہے کہ جب ہم نے پانی کہا، پانی کے معنی ہیں کہ اس سے سیرابی ہوتی ہے، پیاس بجھتی ہے۔ یہ کیسے معلوم ہوا؟ ماں باپ اور ماحول کی نقل میں پانی کو جل، آب، واٹر کہہ دیا۔ یہ معنی کیسے دماغ میں آتے ہیں کہ پانی پینے کی چیز ہے؟

پیاس لگی۔ ارادے کے بغیر معنی پہنائے۔ آپ کے ذہن میں پیاس کا مطلب پانی پینا ہے۔ یہ بات آپ کو کس نے بتائی کہ پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے؟ ماحول سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ تجربے سے ہے۔ ایک سال کے بچے کا کیا تجربہ ہوگا؟ وہ بھی پانی کہتا ہے۔ ہم کہیں کہ انسپائر ہوا تو سوال پیدا ہوتا ہے کس نے انسپائر کیا؟ کہاں سے انسپائر ہوا؟

دو سال کے بچے کو پیاس لگتی ہے۔ وہ کہتا ہے، اماں، پانی۔ کس نے بتایا کہ میرے اندر دماغ

میں تقاضا پیدا ہو رہا ہے، وہ پانی پینے سے پورا ہو گا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ جبلّی تقاضا ہے تو جبلّت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ دو چیزیں ہیں۔ جبلّت اور فطرت۔ جبلّت کا مطلب ہے ہر آن ہر لمحہ اس میں تبدیلی آتی ہے۔ فطرت اسے کہتے ہیں جس میں کسی بھی لمحہ، کسی بھی آن تبدیلی نہ ہو۔

بچے کو کیا پتہ لاشعور کا۔ پیاس لگتی ہے تو اندر تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اندر کوئی مشین لگی ہوئی ہے اس کو حضور قلندر بابا اولیاؒ "جوّیہ" فرماتے ہیں، وہ انفارم کرتا ہے، پانی پیو کہ پیاس بجھے۔ بھوک لگتی ہے، کھانا کھاؤ۔ یہ سب چیزیں کہاں ہو رہی ہیں؟ باہر نہیں ہو رہیں۔

لحاف پاس پڑا ہوا ہے، سردی لگ رہی ہے اور خیال نہ آئے کہ لحاف اوڑھنا یا سویٹر ہونا چاہئے، نمونیا ہو جائے گا، اسپتال پہنچ جاؤ گے۔ کیوں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اندر مشین لگی ہوئی ہے جو انفارمیشن فراہم کرتی ہے اور انفارمیشن میں معنی بھی پہناتی ہے۔ اس کو روح بھی کہہ سکتے ہیں، اس کو جوّیہ بھی۔ بہت سارے نام ہیں۔

جو کچھ ہم کر رہے ہیں، اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک روح انفارم نہ کرے۔

بس آج کے لئے اتنا کافی ہے۔ زیادہ بوجھ پڑ جائے گا۔ اس کو آپ نقل کریں اور غور کریں کہ پیاس کیوں لگتی ہے؟ گلا خشک ہو رہا ہے، ہونٹ سوکھ رہے ہیں، کیوں؟ پیاس کیوں لگی، کہاں لگی اور پانی پینے سے پیاس کیسے بجھ گئی؟ اس پر غور کریں اور اس کو لکھیں کہ پیاس کہاں لگ رہی ہے؟ پیاس بذاتِ خود کیا ہے؟ اگر پانی سے پیاس بجھ جاتی ہے تو پانی کیا ہے؟ اور کئی دفعہ پانی سے بھی پیاس بجھ نہیں سکتی۔

ایک بیماری ہوتی ہے، اسے استسقا کہتے ہیں۔ اس میں پیاس لگتی رہتی ہے بالآخر پیٹ پھٹ جاتا ہے اور آدمی مر جاتا ہے۔ بھوک کا بھی ہے کہ آدمی کھاتا چلا جاتا ہے، پیٹ نہیں بھرتا اور وہ مر جاتا ہے۔ کیوں مر جاتا ہے—؟

جو ترتیب اور توازن اور مقداریں اللہ تعالیٰ نے متعین کر دی ہیں، ان معین مقداروں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

پانی کو اندر جا کے سیرابی کا مطلب یہ ہے کہ یہ پورے خون میں چلا جائے اور خون میں شامل ہو کر رگ رگ میں اتر جائے۔

آج کی کلاس یہاں ختم کرتے ہیں۔

سوچئے اور لکھئے

زبان طرز فکر، رسم و رواج، ثقافت، تاریخ اور تنوّع کی عکاس ہے۔ دنیا بھر میں 200 سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ تعداد منحصر ہے کہ ماہرِ لسانیات زبان اور بولی میں فرق کیسے کرتے ہیں کیوں کہ زبانیں بدلتی رہتی ہیں اور لوگوں کی نقل و حرکت، تجارت اور مختلف زبانوں کے آپس میں میل جول کی وجہ سے ایک دوسرے سے الفاظ لیتی ہیں۔ زبانیں اس وقت ختم ہوتی ہیں جب ان کے بولنے والے کم ہو جاتے ہیں یا کوئی دوسری زبان غالب آجاتی ہے۔

آدمی لہروں کے ذریعے گفتگو کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس نے بات چیت کے لئے خود کو حروفِ تہجی کا پابند کرلیا ہے۔ فی زمانہ سب سے کم حروفِ تہجی روٹوکاس زبان میں ہیں لیکن غور طلب ہے کہ اس سے اظہار کے ذرائع محدود نہیں ہوئے یعنی آدمی خیالات کی منتقلی کے لئے الفاظ کا پابند نہیں۔ وہ چند الفاظ میں پوری گفتگو کرسکتا ہے۔ روٹوکاس زبان 12 حروف پر مشتمل ہے۔ اسے پاپوانیوگنی کے بوگن ویل جزیرے پر چار ہزار سے زیادہ افراد بولتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زبان میں ناک سے نکلنے والی آوازیں نہیں ہیں جیسے ''ن'' کی آواز۔

موجودہ زبانوں میں سب سے زیادہ حروفِ تہجی کمبوڈیا کی سرکاری زبان کھمر (Khmer) میں ہیں۔ اس میں 74 حروف ہیں۔ یہ دنیا کے پیچیدہ ترین تحریری نظاموں میں سے ایک ہے۔

الفاظ بات چیت کا ایک ذریعہ ہونے کے ساتھ انسانی تہذیب کا ریکارڈ ہیں۔ روٹوکاس کے 12 حروف پر مشتمل چھوٹے حروفِ تہجی سے لے کر Khmer کے 74 حروف پر مشتمل پیچیدہ رسم الخط تک، دنیا کی زبانیں ایک طرف آدمی کی فکری وسعت اور دوسری طرف محدودیت کو ظاہر کرتی ہیں کہ اس نے لہروں کی زبان سیکھنے کی بجائے اس صلاحیت کو متعدد زبانوں اور حروفِ تہجی میں تقسیم کر دیا ہے۔

★ قارئین خواتین و حضرات اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرسکتے ہیں۔

حامد ابراہیم

دروازے کے پار کیا کچھ منتظر ہے!

صاحبِ علم و یقین فرماتے ہیں، ”اصل عامل تو بہت ہی شاذ ہوتے ہیں البتہ بخشے ہوئے عامل کافی پائے جاتے ہیں۔“

دنیا کی روش رہی ہے کہ ایک طرف لوگ علم و حکمت کے خزانوں کے لئے دور دراز خطوں، درس گاہوں، جنگل، بیابان اور کوہ و دمن کی خاک چھانتے ہیں اور حاصل ہونے والے ٹوٹے پھوٹے سنگریزوں کو شعور اور تہذیب کی معراج قرار دیتے ہیں لیکن جب قدرت کی مہربانی سے کوئی اولی الالباب ہستی زمین پر ظاہر ہوتی ہے اور صفاتِ الٰہیہ کے علوم کے انمول جواہر مخلوق کے لئے پیش کرتی ہے تو مادی شعور کے حامل لوگ ان کی قدر و قیمت جانے اور سمجھے بغیر خاک اور کنکر چھاننے میں مگن رہتے ہیں۔

خانوادہ سلسلۂ عظیمیہ، واقفِ اسرارِ کُن فیکون حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ نے وصال سے قبل 27 جنوری 2025ء کو خطاب میں فرمایا،

”میرا مشن کیا ہے —؟ خاتم النبیین حضور پاکؐ کا چھوڑا ہوا علم جو حضور پاکؐ نے قلندر باباؒ کو سکھایا، حضور قلندر باباؒ نے مجھے سکھایا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے اس جائیداد کو ضائع نہ کریں۔ اس جائیداد کو ضائع نہ کریں۔ اس جائیداد کو ضائع نہ کریں۔“

ان الفاظ میں تفکر سے احساسِ ذمہ داری کے علاوہ بے پناہ دردِ دل کا احساس ہوتا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام اور خاتم النبیین حضرت محمدؐ کے روحانی علوم کا یہ ورثہ، ایسی جائیداد ہے جو قرآن کریم میں بیان تخلیقی فارمولوں اور علمِ لدُنّی پر مبنی حصے ”معاد“ کا نایاب خزانہ ہے۔ اس خزانے میں باطنی علوم کی بے شمار جہتیں ہیں۔

—◎—

حاملِ علمِ لدُنّی حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

کی ذاتِ والا صفات سے جو علوم نوعِ آدم اور نوعِ جنات کو میسر آئے ہیں، ان میں سے چند کا مختصر تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔

① علمِ رویا (خواب اور تعبیر کا علم): قرآن کریم میں خواب اور ان کی تعبیر کی تفصیل ہے۔ رسول اللہؐ نے خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ فرمایا ہے۔ علمِ رویا نوعِ انسانی کو حاصل پیغمبران کرام علیہم السلام کے روحانی علوم کے ورثے کا حصہ ہے — یہ علمِ حضوری کی طرزوں پر کسی عارف باللہ کی تربیت اور نگاہِ کرم سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے — وہ عارف جسے خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی بارگاہ سے یہ علم عطا ہوا۔

محترم عظیمی صاحبؒ فرماتے ہیں،

"خواب کی تعبیر کا علم سیکھنے سے نہیں آتا۔ یہ علم قدرت کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔"

یعنی یہ علم اکتسابی طرزوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ علمِ حضوری کا ایک باب ہے۔

خواب کی تعبیر پر لکھی گئی عام کتابیں پڑھ کر تاثر ملتا ہے کہ دو افراد خواب میں گائے دیکھتے ہیں تو دونوں کے لئے معانی ایک ہیں۔ اس کے برعکس علمِ رویا سے واقف الشیخ عظیمی صاحبؒ نے اپنی نادرِ روزگار کتاب "آپ کے خواب اور ان کی تعبیر" میں لکھا ہے کہ ایک شے مختلف افراد کے لئے یکسر مختلف معانی رکھتی ہے اور اس کا انحصار افراد کے رجحانات اور طبائع پر ہے جیسے سانپ کسی کے لئے دولت، کسی کے لئے بیماری، کسی کے لئے دشمن کا اشارہ اور کسی کے لئے کچھ ہو سکتا ہے۔ سانپ کو دیکھنے کے معانی سب کے لئے ایک نہیں ہیں۔ صرف خواب کے علم سے واقف باطنی علوم کے ماہرین بتا سکتے ہیں کہ کس فرد کے لئے کون سے معانی حقیقی ہیں۔

کتاب "آپ کے خواب اور ان کی تعبیر" میں علمِ خواب کی حقیقت، نوعیت، خواب اور نیند کے حواس، خواب کی اقسام اور فنِ تعبیر کا احاطہ سلاست (روانی) وضاحت اور روحانی و سائنسی طرزوں پر کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ علم اللہ کے حکم پر مرشد کامل کی نظرِ کرم سے منتقل ہوتا ہے اور اس کی علمی حیثیت سے صحیح طور پر واقف ہونا سالک کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ کتاب "آپ کے خواب اور ان کی تعبیر" کے مطالعے سے روشن ہے کہ یہ اسلاف کی کتب سے ماخوذ تالیف نہیں بلکہ علمِ لدُنّی کے ایک عالِم کا بے نظیر سرمایہ ہے۔

② ٹیلی پیتھی: ٹیلی پیتھی یعنی انتقالِ خیال اسرار سے پُرعلوم کی دنیا کا ایک علم ہے۔ ٹیلی پیتھی اور اس کی مشقوں پر بہت سی کتب مختلف زبانوں میں تحریر کی گئی ہیں جو خیال کے ماخذ کا عرفان نہ ہونے کی وجہ سے اس علم کی درست توجیہات پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر آدمی کی شعوری سکت مختلف ہے۔ روحانی انسان ہی فرد کی شعوری استعداد کو جان کر مشقیں تجویز کر سکتا ہے۔

محترم عظیمی صاحبؒ نے معلوم تاریخ میں پہلی مرتبہ ٹیلی پیتھی کو پیغمبرانہ طرزِ فکر کی روشنی میں پیش کیا ہے تاکہ جیسے جیسے طالبِ علم اسباق میں آگے بڑھے، توحید کا تصور ذہن میں راسخ ہو اور وہ دیکھ لے کہ کائنات کی ہر شے ربط میں ہے۔ ربط کی بنیاد یہ ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے۔

الشیخ عظیمی صاحبؒ کی تصنیف "ٹیلی پیتھی سیکھئے" مکمل پریکٹیکل ہے جسے کرنے والے کے ذہن میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی البتہ اجازت ضروری ہے۔ یہ انتقالِ خیال پر موجودہ دنیا میں واحد کتاب ہے جو اس علم کا سائنسی و علمی تعارف پیش کرتی ہے، ذہن میں خیر کی طرزیں راسخ کرتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے والا انتقالِ خیال کو انبیاء کرام علیہم السلام کی حیوانات، نباتات اور جمادات سے گفتگو اور قرآن کریم میں سورۃ التغابن کی آیت کہ "آسمانوں اور زمین میں ہر شے اللہ کی تسبیح کرتی ہے"، کی روشنی میں سمجھتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر فرد، ذرّہ اور شے ذہن رکھتی ہے اور اپنے خیالات کو کائنات کے نزدیک اور دور گوشوں میں منتقل کرتی ہے۔

③ رنگ اور روشنی سے علاج: کائنات کی ہر شے بشمول آدمی، حیوانات، نباتات و جمادات، رنگوں کی مخصوص مقداروں اور اقسام سے تخلیق ہوئے ہیں۔ ہر رنگ معین مقداروں کا ایک فارمولا ہے۔ رنگوں کا تناسب بگڑنے سے ذہنی، نفسیاتی یا جسمانی عارضے پیدا ہوتے ہیں۔ جس رنگ کی کمی بیشی ہوتی ہے، اسے معین مقدار کے مطابق کرنے سے توازن قائم ہو جاتا ہے۔

کلر تھراپی یا کروموتھراپی پر پہلے بھی کام کیا گیا ہے اور کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن یہ طریقِ علاج جسمِ مثالی میں تصرّف کے علم پر منحصر ہے۔ جسمِ مثالی کیا ہے اور مادی جسم کو بطور معمول کس طرح چلاتا ہے، کن رنگوں یا مقداروں سے مرکب ہے، جسمِ مثالی میں کسی رنگ کی کمی اور بیشی کا کیا مطلب ہے اور یہ مٹی کے جسم پر کیسے

اثر انداز ہوتا ہے؟ اس پر بات نہیں کی گئی۔

نظریۂ رنگ و نور کے بانی عظیمی صاحبؒ نے رنگوں کی تخلیق، حقیقت، اثرات، خصوصیات، جسمِ مثالی میں رنگوں کا نفوذ، اخراج اور اس کے طریقِ کار کے ساتھ ساتھ جسمِ مثالی میں رنگوں میں توازن کو درست کرکے مریض کو شفایاب کرنے کا علم بیان کیا ہے۔ ان کی کتاب "رنگ اور روشنی سے علاج" میں عوام کی خدمت کے لئے تقریباً ہر چھوٹی بڑی بیماری کا علاج ہے۔

ان کی ایک اور کتاب "کلر تھراپی" رنگوں سے علاج کی سائنس کا تفصیلی تعارف پیش کرتی ہے۔ کلر تھراپی لامحدود علم ہے۔ گہرائی میں مطالعے سے انکشاف ہوتا ہے کہ اگر تحقیق اور تجربات میں رنگ و روشنی کو مرکزیت دی جائے تو ایجاد و دریافت کی دنیا کا در کھلے گا۔ دروازے کے پار کیا کچھ نوعِ آدم کا منتظر ہے!

نظریۂ رنگ و نور کے بانی عظیمی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اگر ہم زیادہ سے زیادہ روشنیوں سے وقوف اور ان کا علم حاصل کرلیں تو سائنسی ترقی میں "ہزاروں سال" آگے نکل سکتے ہیں۔ مغربی دنیا کے ایک کثیرالاشاعت اخبار نے محترم عظیمی صاحبؒ کا انٹرویو کیا اور اس انکشاف پر کہ کائنات رنگوں کے سوا کچھ نہیں اور یہ کہ رنگوں کے امتزاج سے مخلوقات اور انواعِ وجود میں آتی ہیں، وہ بہت حیران اور متاثر ہوئے۔ انٹرویو شائع کرنے سے پہلے اخبار کا بورڈ بیٹھا لیکن علم و تحقیق پر مغرب کی اجارہ داری کھونے کے ڈر سے انٹرویو شائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

رنگ اور روشنی سے علاج مفت برابر ہے اور دنیا کے لئے "احسنِ تقویم انسان" کا تحفہ ہے۔ یہ آدمی کو اسفل سافلین سے نکال کر جہاں بانی کے مقام پر فائز کرسکتا ہے۔

④ نیرنجات: ہزاروں سال قدیم علم ہے۔ یہ وضاحت کرتا ہے کہ کائنات کی ہر تخلیق میں لہریں اور شعاعیں کام کرتی ہیں جن کی مقداروں کی یکجائی کسی شے کا فارمولا بنتی ہے۔ اگر معلوم کرلیا جائے کہ شے میں لہروں یا شعاعوں کا فارمولا کیا ہے تو اللہ کے حکم سے اُس شے میں حسبِ منشا تصرّف کرسکتے ہیں۔

صاحبِ طریقت عظیمی صاحبؒ نے کتابچہ بعنوان "نیرنجات" تحریر فرمایا جس میں اس علم کا تعارف، مبادیات، مشقوں اور عملی تصرّف

کا احاطہ ہے۔ اختصار میں کاملیت اپنے کمال پر ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ اس کتابچے سے پہلے یہ علم تحریری طور پر تاریخ عالم میں کہیں موجود نہیں بلکہ انتہائی مخفی علمِ سینہ کے طور پر موجود رہا ہے۔ کامل استاد کے بغیر اس کی تحصیل کی ممانعت ہے۔

⑤ نظریۂ رنگ و نور: یہ روحانی سائنس کی خالصتاً علمی و نظریاتی کتاب ہے۔ مادی سائنس کی اصطلاح میں ہم "Pure Sciences" کے الفاظ سے واقف ہیں۔ اس کی مثالیں نیوٹن کا "نظریۂ تجاذب" اور آئن اسٹائن کا "نظریۂ اضافیت" ہیں لیکن مادی شعور کی جہاں انتہا ہے، وہاں سے روحانی علوم کی الف ب شروع ہوتی ہے۔ "نظریۂ رنگ و نور" سالک کو مادے کے ہیر پھیر سے نکال کر مشاہدہ کراتا ہے کہ ہر تخلیق نور کے غلاف میں بند ہے۔

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔"

(النور: ۳۵)

نور شے کی تخلیق کی بنیاد اور زندگی کے قیام کے لئے وسائل کی فراہمی کا ذریعہ ہے۔ وسائل سے ذہن میں عموماً کھانے پینے، ہوا، لباس، رہن سہن جیسی چیزیں آتی ہیں لیکن نظریۂ رنگ و نور بتاتا ہے کہ وسائل کی فراہمی اور ان میں تسلسل کی اولین صورت "خیال" ہے۔ خیال کے مدارج اور نزول و صعود کا باقاعدہ نظام ہے۔ خیال کی لہر سے حواس کی درجہ بندی ہوتی ہے اور ہم کائنات کی انفرادیت و اجتماعیت سے منسلک رہتے ہیں۔ "نظریۂ رنگ و نور" کو سمجھنے اور اس کے اطلاق سے مکانیت (اسپیس) کی حد بندی سے آزاد ہو کر آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل سکتے ہیں۔

⑥ روحانی علاج: عملیات و تعویذات کی سیکڑوں قدیم و جدید کتابیں موجود ہیں۔ عامل خواتین و حضرات کی بھی کمی نہیں۔ صاحبِ علم و یقین عظیمی صاحبؒ فرماتے ہیں،

"اصل عامل تو بہت ہی شاذ ہوتے ہیں البتہ بخشے ہوئے عامل کافی پائے جاتے ہیں۔"

بخشے ہوئے عامل کسی عمل کو کسی کتاب سے پڑھ کر اس کی میکانیکی انداز میں تکرار کرتے ہیں اور نتائج سے سروکار رکھتے ہیں، عمل کی روحانی سائنس کا علم نہیں ہوتا اس لئے وہ مرض کو جڑ سے ختم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

اعداد اور ہندسوں میں حکمت کیا ہے، انوار کس طرح کام کرتے ہیں، مخلوقات کے نسمہ میں ان تعویذات اور نقوش کی روشنیاں کیسے منتقل ہوتی ہیں اور اللہ کی مخلوق کی خدمت کے لئے اس حیرت انگیز علم کی افادیت کیا ہے، کتاب ''روحانی علاج'' اس کی جامع دستاویز ہے۔

کتاب کا پیش لفظ بذاتِ خود نصاب ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عمل کی بساط ''یقین'' ہے اور ''قوتِ ارادی'' سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ کتاب میں دو سو سے زیادہ بیماریوں کا علاج ہے۔

محترم عظیمی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ کتاب خاتم النبیین حضرت محمدؐ سے منظور شدہ ہے۔

—•◎•—

قارئینِ کرام! ابدالِ حق قلندر باباؒ کے شاگردِ رشید محترم عظیمی صاحبؒ کا علمی ورثہ اور اس ورثے کی جہتیں لامحدود ہیں۔

اللہ نے اپنے حبیب، خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہؐ کے صدقے، اپنے ایک دوست، اپنے رازوں میں سے ایک راز، حضور پاکؐ کے روحانی علوم کے وارثین میں سے ایک وارث کو ہمارے درمیان بھیجا جن کی ہمیں الحمدللہ،

> ابدالِ حق قلندر باباولیاؒ فرماتے ہیں،
> جس پردے میں دیکھتا ہوں پردا ہے الگ
> جس نقشے میں دیکھتا ہوں نقشا ہے الگ
> ہر ذرّہ میں جمشید و فریدوں ہیں ہزار
> سبحان اللہ کہ مری دنیا ہے الگ

زیارت اور صحبت نصیب ہوئی لیکن اللہ نے اپنے اس بندے کے ذریعے علم کے جو خزانے ظاہر فرمائے، کیا ہمیں اس کی کچھ خبر ہے؟

مضمون میں جن کتب اور علوم کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے ادراک کے لئے ان میں سے ہر کتاب پر بین الاقوامی سطح کی یونیورسٹیاں قائم ہونا ضروری ہیں۔ مغرب نے ہمارے اسلاف کے علم کے ساتھ یہی کیا ہے۔ آج وہاں ہر شعبے اور ان کے ذیلی شعبوں پر تحقیقاتی یونیورسٹیاں قائم ہیں اور ہم اغیار کے دستِ نگر ہیں۔

صاحبِ تکوین حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ کے وسیع و عریض علمی و فکری ورثے کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اس جائیداد کو ضائع نہیں کرنا۔ اس کی حفاظت اسی صورت ممکن ہے جب مرشد کریم کی طرزِ فکر — مرید کی طرزِ فکر بن جائے۔

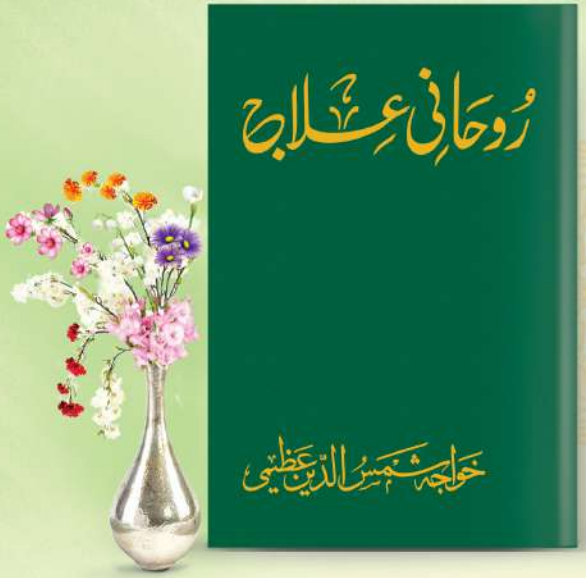

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بوسیلہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ہم سب پر نازل ہوں اور ہمیں جسمانی اور روحانی سکون حاصل ہو، آمین۔

شک اور بے یقینی کے طوفان سے پیدا ہونے والی تقریباً دوسو بیماریوں اور مسائل کو یکجا کر کے کتاب "روحانی علاج" میں ان کا حل شائع کیا گیا ہے۔ کتاب "روحانی علاج" کی مقبولیت کے پیشِ نظر قارئین کے تعاون سے ادارہ "ماہنامہ قلندر شعور" نے اس کتاب کو گھر گھر پہنچانے کا پروگرام بنایا ہے۔

جو خواتین وحضرات راہِ للہ کے اس پروگرام میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔۔۔ ادارے سے رابطہ کریں۔

ملنے کا پتہ : عظیمی یونیورسٹی پریس® سرجانی ٹاؤن، کراچی

+92 307111 5224

info@azeemiuniversitypress.com

زیرِ سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

عظیمیہ روحانی لائبریری جنڈ، اٹک

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات اور طلبہ و طالبات کے لئے عظیمی صاحبؒ کی تحریر کردہ اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

اوقات: عصر تا مغرب روزانہ | حاجی بازار، جنڈ، اٹک۔ موبائل نمبر: 03009145175

روحانی بانو

گیارہ ہزار حواس

جسے ہم چھٹی حس کہتے ہیں، وہ بحیثیت آدمی نہیں — انسان، ہماری پہلی حس ہے جو سماعت، بصارت اور دیگر حسیات کی راہ نمائی کرتی ہے۔

مچھلی گہرے پانی میں ہے۔ بظاہر اسے آسمان نظر آرہا ہے نہ وہ بادلوں کو دیکھ رہی ہے اور نہ آسمان میں بجلی کی چمک کو پانی کے اندر سیکڑوں فٹ گہرائی میں محسوس کر رہی ہے۔* تیرتے ہوئے اچانک بے چین ہوتی ہے اور تیزی سے راستہ بدل لیتی ہے۔ ایسے مقام کا رخ کرتی ہے جہاں بے چینی کا اثر نہ پہنچا ہو۔ وہ اکیلی نہیں ہے جس نے موجوں کی روانی میں تناؤ محسوس کیا۔ اوپر اور درمیانے طبقے کی مچھلیاں بھی پانی کے اندر اور باہر موسم کے مزاج میں تبدیلی کا ادراک ہوتے ہی محفوظ مقام کا رخ کرتی ہیں۔ پانی کا وہ حصہ جس میں لہریں اضطراب کی زد میں ہیں، آبی مخلوقات سے خالی ہو جاتا ہے — کچھ دیر میں طوفان آتا ہے۔

لہروں میں اضطراب کیوں پیدا ہوا؟

طوفان مخلوق ہے، باحواس سراپا ہے — اپنی موجودگی ظاہر کرتا ہے۔ کیا مچھلیوں نے طوفان کے سراپا کو مجسم ہوتے دیکھ لیا تھا؟

انہوں نے اس کی آواز سنی؟

یہ دیکھ لیا کہ اضطراب نے سمندر میں مخصوص فاصلے تک ایک محیط قائم کر لیا ہے؟

مچھلیوں کو جس ذریعے سے طوفان کا پیشگی علم ہوا، کیا آدمی کے اندر وہ صلاحیت بیدار ہے؟

آدمی دنیا کو جاننے اور سمجھنے کے لئے پانچ حواس استعمال کرتا ہے — سننا، دیکھنا، چھونا، سونگھنا اور بولنا۔ بچپن سے ارادی اور غیر ارادی طور پر ماحول نے سکھایا ہے کہ یہ پانچ حواس دنیا سے واقف ہونے کے پانچ ذرائع ہیں اور چھٹی حس انہونی ہے جو خاص وقت پر دستک دیتی

* ممکن ہے کسی نہ کسی درجے میں محسوس کرتی ہو لیکن یہ محسوسیت کسی امر کی پابند ہے۔

ہے — جب کہ چھٹی حس ہمہ وقت ہمارے ساتھ ہے اور تعطل کے بغیر صحیح کو صحیح کہتی ہے اور غلط سے دور رکھتی ہے، فرد اس کا معمول* بن جائے تو ماضی اور مستقبل کو آنکھوں کے سامنے روشن کر دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے ہم چھٹی حس کہتے ہیں، وہ بحیثیت آدمی نہیں — انسان، ہماری پہلی حس ہے جو سماعت، بصارت اور دیگر حسیات* کی راہ نمائی کرتی ہے۔

باطنی علوم کے ماہرین فرماتے ہیں کہ انسان کے اندر گیارہ ہزار حواس ہیں اور ہر حس کی صلاحیت لامحدود ہے۔ گیارہ ہزار حواس، گیارہ ہزار سراپا ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ گیارہ ہزار حواس سے لاعلم آدمی نے خود کو پانچ حواس کا پابند کر لیا ہے اور فکری محدودیت کی وجہ سے ان پانچوں کے دائرۂ کار کو بھی اپنے لئے محدود کر لیا ہے۔ ان حواس میں کتنی وسعت ہے، تصور کی دنیا اس کا ایک مظاہرہ ہے جب کہ نیند کی دنیا میں ان کی لامحدودیت کا مشاہدہ روز کے تجربات میں شامل ہے۔ مثال کے طور پر نیند کے وقفے میں ہم میلوں میل فاصلہ طے کرتے ہیں، وہاں کھاتے پیتے ہیں، خوش بو محسوس کرتے ہیں، لوگوں سے ملتے ہیں، بات کرتے ہیں، جس جگہ کا خیال آتا ہے، پہنچ جاتے ہیں، جس شے کا خیال آتا ہے، سامنے یا ہاتھ میں ہوتی ہے۔ گھر میں بیٹھے ہوئے آنکھوں کے سامنے اسکرین روشن ہوتی ہے اور ہم دور دراز کی سیر اور دور موجود رشتہ داروں کے احوال کو اس طرح دیکھتے اور ان کی آوازیں سنتے ہیں جیسے وہاں موجود ہوں۔ کہیں جاتے ہیں تو پلک جھپکتے میں واپس آجاتے ہیں۔ یہ سب نیند کے وقفے میں ہوتا ہے اور کوئی فرد اس سے انکار نہیں کرتا بلکہ جاگنے کے بعد اقرار کرتا ہے کہ میں یہاں گیا، وہاں گیا، یہ دیکھا، فلاں سے ملاقات کی اور میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔

ان مثالوں میں کوئی ایک منظر یا کیفیت ایسی نہیں جو پانچ بنیادی حواس سے باہر ہو جن کو اس دنیا میں ہم محدود طرزوں میں استعمال کرتے ہیں۔ دوسری طرف نیند کی دنیا میں ان حواس سے استفادہ کرنے والے بھی ہم ہیں۔

یہ صرف پانچ حواس کی بات ہے کہ ان کا دائرہ کس حد تک وسیع ہے لیکن اس امر سے صَرفِ نظر ممکن نہیں کہ نیند کی دنیا میں یہ پانچ

* معمول (بلاچون وچرا عمل کرنے والا) * حسیات (Senses)

حواس ایسی حس کے تابع ہیں جس کو جاگنے کے بعد ہم چھٹی حس کہتے ہیں۔

حواس ایک دنیا ہے۔ اس پر غور کرنے سے ذہن کی اسکرین پر تصویر ظاہر ہوتی ہے جس میں تمام حواس خانے ہیں اور ایک حس سے فیڈ ہوتے ہیں۔ فیڈنگ کا نظام برقی رَو، سگنلز یا برقی اشاروں (electrical signals) پر قائم ہے۔ سننا، دیکھنا، سونگھنا، کھانا اور محسوس کرنا برقی اشاروں کی شکل میں دماغ تک پہنچتا ہے۔ آواز ہو، رنگ، ذائقہ، خوش بو، بدبو یا سرد و گرم کا احساس ہو، رشتے ناتے ہوں، ماحول اور وہ تمام چیزیں جن سے ہم ربط میں ہیں، برقی اشاروں کی شکل میں احساس بنتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں، ہم کسی شے اور رشتے سے براہِ راست ربط میں نہیں ہیں بلکہ ان لہروں کی مدد سے ایک دوسرے سے واقف ہیں جو رابطے کا فریضہ انجام دیتی ہیں، فرد کے احساس کو فرد اور فرد کو شے کے احساس سے ملاتی ہیں۔ یعنی ہم دنیا کو براہِ راست نہیں دیکھتے — نہ کوئی آواز بلاواسطہ سنتے ہیں اور نہ کسی چیز کو واسطے کے بغیر چھوتے ہیں، ہم فرد اور شے کے برقی عکس کو محسوس کرتے ہیں جو دماغ میں بننے والی تصویر کی شکل میں ہم تک پہنچتا ہے۔

بیان کرنے کی تیسری طرز یہ ہے کہ دنیا کی تمام اشیا، واقعات اور احساسات کا وجود "خیال" ہے جو اندر میں اسکرین پر نمودار ہوتا ہے۔ جیسے کسی اسکرین پر تصویر بنتی ہے، ویسے ہی دماغ ایک اسکرین ہے جو برقی سگنلز کی مدد سے دنیا کو دیکھتا اور دکھاتا ہے۔

ہم دنیا اور موجودات سے برقی سگنلوں، عکس اور خیال کی طرزوں میں واقف ہیں۔ سمجھنے کی مذکورہ تینوں طرزیں جس مقام پر یکجا ہوتی ہیں، اس کا بیان ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ کی اس رباعی میں ہے،

خانے ہیں دماغ کے وہ خالی ہیں سب
چیزیں جو نظر آتی ہیں جعلی ہیں سب
ہر لمحہ بدلتا ہے جہاں کا منظر
نظارے بھی آنکھوں کے خیالی ہیں سب

دماغ میں جتنے خانے ہیں، سب خالی ہیں۔ کہیں سے برقی رَو آتی ہے اور ان خانوں میں عکس بناتی ہے۔ عکس دیرپا نہیں ہوتا۔ آنکھیں جو دیکھتی ہیں، وہ خیال کے سوا کچھ نہیں۔ یہ اور

بات ہے کہ خیال کس کا ہے!

ذہن سوال کرتا ہے کہ جب سب کچھ عکس یا خیال ہے تو پھر یہ سب ہے کہاں؟ ہم کہیں سے آنے والے برقی سگنلوں کی ایک خاص ترتیب ہیں تو پھر کہنا بجا ہے کہ زمین اور اس کے مکین (بشمول ہمارے) جن کو ہم آس پاس دیکھتے ہیں، وہ زمین پر نہیں، کہیں اور ہیں۔ جس طرح دماغ کے خانے خالی ہیں، اسی طرح زمین کی اسکرین بھی خالی ہے۔ کہیں سے برقی رَو آتی ہے اور متفرق مقداروں کے ساتھ زمین پر نقش و نگار بناتی ہے— کہیں پھول پودے بنتی ہے، کہیں پہاڑ، کہیں نباتات اور کہیں حیوانات اور دوسری موجودات وغیرہ۔ ہم خیال کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خیال کہاں سے آتا ہے اور یہ کس کا خیال ہے؟

ہر شے خیال ہے، یہ بات شے کے ہونے کی نفی ضرور کرتی ہے لیکن خیال کا اثبات اپنی جگہ موجود ہے جس کی بساط پر کائنات قائم ہے۔ ہر فرد اور دریافت کا آغاز خیال سے ہے۔ خیال شے کو ظاہر نہ کرے، شے کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ جب دریافت خیال کی پابند ہے تو معانی یہ ہوئے کہ کوئی شے "ایجاد" نہیں ہے بلکہ پہلے سے موجود شے کی دریافت ہے۔ وہ شے اس دنیا میں ظاہر ہونے سے پہلے کہاں موجود ہے، خیال اس سے واقف ہے۔

محقق مشین کو دیکھتا ہے تو خیال آتا ہے کہ مجھے اس میں ایسا پرزہ شامل کرنا ہے جس سے رفتار دگنی ہو جائے۔ اس خیال میں مشین کے اس پرزے کی تصویر موجود ہے اور یہ اس لئے آیا ہے کہ اب اُس پرزے کے ظاہر ہونے کا وقت ہے جس سے مشین کی رفتار میں اضافہ ہوگا اور اس اضافے کا تعلق موجودہ دور کے کسی نظام میں تسلسل اور ترقی سے ہے۔ جیسے ہی محقق یکسو ہوگا، خیال میں پنہاں پرزے کی تصویر اور اس میں رفتار کا میکانزم ظاہر ہو جائے گا۔

یہاں محقق اور اس مچھلی کا ذہن ایک ہو گیا جس نے آنے والے حالات کا ادراک کیا۔ جس طرح رفتار میں تیزی کے لئے خیال نے محقق کی راہ نمائی کی، اسی طرح مچھلی کو موجوں میں ظاہر ہونے والی تیزی یعنی طوفانی ابھار سے خبردار کرنے والا بھی "خیال" ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ثمینہ عامر

مصروفیت کے رنگ

کولہو کا بیل آنکھوں پر پٹی بندھنے سے خود کو چلنے پھرنے میں آزاد سمجھتا ہے۔ وہ آزاد نہیں، فرضی خیالات کی قید میں ہے۔ جس دن پٹّی اترے گی، وہ کولہو کا بیل نہیں رہے گا۔

- آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔
- کہاں ہیں؟ نظر نہیں آتے۔
- زہے نصیب! آج ہماری بھی قسمت جاگی۔

؎ وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

یہ الفاظ ہمارا معمول بن چکے ہیں — نہ صرف دوسروں سے سنتے ہیں بلکہ خود بھی دہراتے ہیں۔ جواب میں بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے،

"بس، وقت نہیں ملا۔"

سوال یہ ہے کہ کیا واقعی وقت نہیں ملتا یا ہم نے بعض رشتوں، ان سے وابستہ احساسات یا دیگر امور جو ہمارے لئے غیر اہم لیکن حقیقت میں اہم ہیں، ان کو ترجیحات سے نکال دیا ہے؟

امورِ خانہ داری میں عام ہے کہ گھر یا کمرے میں داخل ہوتے وقت کوئی کہتا ہے کہ چیزیں بکھری ہوئی کیوں ہیں؟ کمرے کی صفائی نہیں کی؟ جواب ملتا ہے، وقت نہیں ملا۔

کیا صفائی کے لئے 24 گھنٹوں سے ہٹ کر وقت درکار ہے؟ صفائی تو بذاتِ خود وقت کا تقاضا ہے۔ جس کے پاس صفائی کے لئے وقت نہیں، اسے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کے شب و روز کن مصروفیات میں گزرتے ہیں۔

ہمارے پاس ان لوگوں اور کاموں کے لئے وقت ہے جن سے ہمیں فائدہ ہو یا روزمرہ کی مصروفیات وابستہ ہوں مگر وہ رشتے جنہوں نے سہارا دیا، جن کے ساتھ بچپن کی یادیں جڑی ہیں، جن کی دعائیں ساتھ ہیں — اور وہ کام جن سے زندگی ترتیب میں آتی ہے، ان کے لئے ہمارے پاس صرف ایک جملہ ہے،

وقت نہیں ملا!

جب ہم کہتے ہیں کہ وقت نہیں ہے تو ایک طرح سے اندر میں سوچ کا اظہار کرتے ہیں کیوں کہ جو شخص اور کام ہماری ترجیحات میں شامل نہیں، چاہے وہ ماں باپ کا رشتہ کیوں نہ ہو، ہمارے پاس ان کے لئے وقت نہیں ہے۔

بیٹا ماں سے ملنے آتا ہے تو ماں کہتی ہے کہ بہت دن بعد آئے۔ وہ کہتا ہے کہ دفتر میں کام بہت تھا، وقت نہیں ملا جب کہ اس دوران وہ بیوی بچوں کو سیر پر لے گیا اور دفتری کام کے علاوہ دیگر امور انجام دیے۔

وہ ایسا کیوں کہتا ہے؟

جواب قارئین تلاش کریں۔

صورتِ حال یہ ہے کہ آج کل ماں باپ بچوں سے کہتے ہیں کہ ابھی وقت نہیں۔ اماں ڈانٹتی ہیں کہ میرے پاس وقت نہیں، جلدی کھانا کھاؤ۔ کھانے کے بعد ماں سوشل میڈیا پر مشغول ہو جاتی ہے اور باپ بھی چھٹی والے دن زیادہ وقت گھر کی سماجی زندگی کو چھوڑ کر فیس بک، ایکس، انسٹاگرام، اسنیپ چیٹ یعنی سوشل میڈیا کو دیتا ہے — بچے یہ سب دیکھتے ہیں۔

وقت لامحدود ہے لیکن دلچسپی کا فقدان ہے، اہمیت نہیں ہے۔ جہاں دل ہوتا ہے، فاصلہ معنی نہیں رکھتا، مصروفیت خود راستہ دیتی ہے۔

وقت نہیں ہے یا وقت نہیں ملا، عام بات ہو گئی ہے۔ کیا واقعی ہمارے پاس وقت نہیں؟

شعوری لحاظ سے وقت ہر ایک کے پاس برابر ہے — 24 گھنٹے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ لاشعور میں بھی وقت کی فرداً فرداً تخصیص نہیں بلکہ وہاں وقت کا شمار نہیں۔ لاشعوری ذہن کے خواتین و حضرات ایک زندگی میں صدیوں کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ وہ کام کے ساتھ ساتھ رشتے نبھاتے ہیں، لوگوں سے ملتے ہیں، خدمت کرتے ہیں، فلاحی کام کرتے ہیں، مطالعہ کرتے ہیں اور عبادت و ریاضت بھی کرتے ہیں — ان کا اصل سے رشتہ قائم رہتا ہے۔ یہ بھی زندگی ہے اور یہی اصل زندگی ہے۔

آپ نے تمہید پڑھی۔

یہ تمہید نہیں، مصروفیت کے رنگ ہیں۔

مصروفیات کو رنگوں سے سمجھنا چاہیں تو بات یہ ہے کہ جو مصروفیت محض عارضی زندگی سے

وابستہ ہے اور وہ ذہن جس میں بے حسی ہے، اس کی مصروفیت کے رنگ کچے ہوتے ہیں۔ یہ وقت کے ساتھ اترتے اور چڑھتے ہیں۔ ان کا زندگی کے حقیقی رنگوں سے تعلق نہیں۔

زندگی کے حقیقی رنگ کیا ہیں—؟

وہ رنگ جن کو اختیار کرنے سے اصل سے وصل ہوتا ہے۔ جن میں تغیر نہیں ہے۔ طوفان اٹھے، گرد باد آئے، یہ رنگ اپنی حالت پر قائم رہتے ہیں۔ یہ کون سے رنگ ہیں—؟

وقت بہت قیمتی ہے۔ گزر جائے تو واپس نہیں آتا۔ جب "اِس دنیا تک محدود مصروفیت" کے سارے رنگ اترتے ہیں تو ہمارے پاس دوسری دنیا کے لئے سرمایہ نہیں ہوتا۔ جو کام کیا، اس دنیا میں وقت سنوارنے کے لئے کیا جب کہ "وقت نہیں ہے"۔ اس کا اندازہ موت کے وقت ہوتا ہے جب پوری زندگی کی فلم جس کو ہم مصروفیت کہہ سکتے ہیں، چند سیکنڈ میں نشر ہو جاتی ہے۔ خواہ یہ 70 سال کی ہو، 60 یا 45 سال کی— "بہت مصروف" رہنے والا آدمی خالی ہاتھ زمین کے اندر چلا جاتا ہے۔ اس نے فطرت کے خلاف مٹی کی مصروفیات کا اہتمام کیا جب کہ مٹی نے ایسے رنگوں کی نفی کر کے اسے اپنے رنگ کے ہم رنگ کر دیا۔

مٹی اللہ کی فرماں بردار مخلوق ہے۔ یہ جانتی ہے کہ "ایک رنگ زمین" پر جتنے رنگ ہیں، سب فریبِ نظر (illusion) ہیں کیوں کہ یہ ایک رنگ سے دور— بہت دور ہیں۔

فرض کیجئے کہ مٹی ہزار رنگ ظاہر کرتی ہے۔ ہزار رنگ ہزار مصروفیات ہیں۔ ان میں ایک رنگ ایسا نہیں جو مٹی کا اصل رنگ ہوتا وقتیکہ یہ (رنگ) دوری ختم کر کے ایک نہ ہو جائیں۔

دوسری طرف وقت کی قدر کرنے والے بھی دنیا سے گزر جاتے ہیں لیکن مٹی ان کے اجسام کی حفاظت کرتی ہے۔ کائنات کے نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کی مصروفیات معمول کی طرح جاری رہتی ہیں— دنیا ان کے فیض کو محسوس کرتی ہے۔

مضمون میں دنیاوی مصروفیات ترک کرنے کا مشورہ نہیں ہے۔ دنیا مصروف رہنے کے لئے ہے لیکن ان مصروفیات میں ذہن اپنی اصل،

اپنی اساس (base) سے وابستہ رہے۔

دنیاوی لحاظ سے اولاد کی اصل ماں باپ ہیں۔ اولاد کا رنگ فرماں برداری ہے۔ اگر اس کو ماں باپ یاد نہیں ہیں تو اس کی حیثیت کیا ہوئی؟

ماں کا رنگ ماتا اور باپ کا رنگ شفقت ہے۔ ماں باپ کو اولاد کی تربیت کی فکر نہیں ہے تو ماں کا رنگ اور باپ کا رنگ کہاں گیا؟

کیا یہ اصل سے دوری نہیں ہے؟

کیا ان تقاضوں کا ترک نہیں ہے جن کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے رشتے قائم کئے ہیں؟

شب و روز کا جائزہ لیں تو لگتا ہے کہ ہماری فہم زنگ آلود ہے۔ حرکت بہت ہے، پیش رفت نہیں ہے۔ دن بھر "مصروف" رہتے ہیں، ہر طرف دوڑ دھوپ ہے لیکن نتیجہ بے نتیجہ ہے۔

آپ نے کولہو کا بیل دیکھا ہے؟

وہ مصروف رہتا ہے مگر حاصل کیا ہے؟

کولہو کے بیل کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی جاتی ہیں تاکہ وہ دیکھے بغیر چلتا رہے اور یہ سمجھے کہ اس نے چلتے چلتے میلوں میل طے کر لئے ہیں۔ گھومتے گھومتے پہیّہ جام ہوتا ہے اور بیل زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔

ہماری آنکھوں پر اس قسم کی "مصروفیت" کی پٹی ہے جو سوچنے کی مہلت دیتی ہے نہ رکنے کی اجازت۔ ضروری کو غیر ضروری اور غیر ضروری کو ضروری بنا دیتی ہے — مقصد کھو جاتا ہے۔

کولہو کا بیل آنکھوں پر پٹی بندھنے سے خود کو چلنے پھرنے میں آزاد سمجھتا ہے۔ وہ آزاد نہیں، فرضی خیالات کی قید میں ہے۔ اس کے اندر اتنی قوت ہے کہ رسّی کو توڑ سکے — وہ رسّی یا زنجیر کا نہیں، فرضی رنگوں پر مبنی تصورات کا قیدی ہے۔ جس دن پٹّی اترے گی، وہ کولہو کا بیل نہیں رہے گا۔

تجربہ ہے کہ مصروفیت اچھی ہے تو چہرے کا رنگ کِھلا ہوا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ مصروفیت اچھی ہوتی ہے لیکن ذہن کہیں اور مشغول ہوتا ہے جیسا کہ وسوسے جو کسی بھی شکل میں ہو سکتے ہیں۔ نتیجہ سامنے ہے — پھیکے چہرے، شکن آلود جبینیں، تُرش لہجے، منافق روّیے، زبان پر اور ہاتھوں میں دل آزاری کے ہتھیار — یہ سب مصروفیات ہیں لیکن ان کا رنگ کیا ہے —؟

وہی جو چہرے پر ہے۔

جو شخص ''اندر میں'' سے قریب ہے، اندر کے رنگ کو اختیار کرتا ہے، اس آواز کے رنگ کو جو قدم قدم راہ نما ہے، اس کے لطائف رنگین ہو جاتے ہیں۔ انسان کے اندر چھ لطائف کام کرتے ہیں— یہ توانائی کے باطنی مراکز ہیں۔ ان مراکز میں دَور کرنے والے علوم سے واقفیت لطائف کا رنگین ہونا ہے جو کامل مرشد کی سرپرستی کے بغیر ممکن نہیں۔

مرشد کی اندر باہر مصروفیات کا رنگ جب مرید کے رنگ پر غالب آتا ہے، جتنا مرشد چاہتا ہے تو مرید کے لطائف رنگین ہو جاتے ہیں۔ اسے مرشد کی طرز فکر حاصل ہو جاتی ہے اور مرشد فنافی الرسولؐ، فنافی اللہ ہوتا ہے۔

ایک مصروفیت ظاہری اور ایک ذہنی ہے۔ مصروفیت کا انتخاب رنگ کا انتخاب ہے۔ رنگ اچھا ہے تو آدمی کے پاس ہر اچھے کام کے لئے وقت ہے۔ محترم عظیمی صاحبؒ نے متوازن زندگی کی ترتیب بیان فرمائی ہے۔

''انسان تین وقفوں میں زندگی گزارتا ہے۔

① حصولِ معاش میں آٹھ گھنٹے۔

② حقوق اللہ، حقوق العباد کو پورا کرنے میں آٹھ گھنٹے۔

③ آرام کرنے اور زندگی کے لئے توانائی حاصل کرنے کے لئے آٹھ گھنٹے۔

ان حصوں میں سے ایک حصے میں کھانا پینا، کاروبارِ معاش اور زندگی کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ ان سولہ گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے میں من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ (جس نے خود کو پہچان لیا پس تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچان لیا) کے زیرِ اثر آتے ہیں۔ یہ وہ عرصہ ہے جس عرصے میں انسان غور و فکر کرتا ہے کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ مجھے کس نے پیدا کیا ہے؟ کیوں پیدا کیا ہے اور میری تخلیق کا منشا کیا ہے؟ اس طرح انسان کو آٹھ گھنٹے باطن کا تزکیہ کرنے کے لئے مل جاتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کو پہچان لے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ 'ہم اس کی رگِ جان سے زیادہ اس سے قریب ہیں۔' (قٓ: ۱۶)

انسان کے پاس آٹھ گھنٹے سونے آرام کرنے، صحت مند اور بیمار رہنے کے لئے باقی رہتے ہیں۔'' (کتاب: آگہی)

عظیمی

روغن گلوسبز

پُرسکون نیند لاتا ہے

سر کے جملہ امراض اور

ہائی بلڈ پریشر میں مفید ہے

چاند کی کرنیں جذب کر کے تیار کیا جاتا ہے

125ml

Rs. 500

پاکستان بھر میں ہوم ڈلیوری کی سہولت

0332 308 5058

عنبرین ساجد

حضرت بسیرہؓ

حضرت بسیرہؓ کا عزم و استقلال دیکھ کر رشتہ داروں نے سوچا کہ رسول کریمؐ کے پیغام میں ضرور ایسی بات ہے کہ جو اس پیغام کو قبول کرتا ہے، جاں نثار ساتھی بن جاتا ہے۔

حضرت بسیرہؓ بلند حوصلہ اور بہادر خاتون تھیں۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد کٹھن حالات و مشکلات کا ثابت قدمی اور صبر کے ساتھ سامنا کیا۔ ان کا تعلق عرب کے ایک جنگجو قبیلے سے تھا۔ حرب وضرب* کی صلاحیتوں سے واقف تھیں۔ دیگر عرب قبائل کی طرح اس قبیلے کی معاشی سرگرمیاں مویشیوں کی دیکھ بھال اور تجارت تھا۔ یہ لوگ ملک شام سے تجارتی مال لاتے اور مکہ مکرمہ اور قریب دور علاقوں میں فروخت کرتے تھے۔ بعض لوگ سامانِ تجارت لے کر بصرہ (عراق) جاتے اور واپسی پر وہاں سے مال لاتے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس قبیلے میں ایسے افراد بھی تھے جو یہودی و عیسائی راہبوں کے عقیدت مند تھے۔ یہ راہب الہامی کتابوں کے مطابق آخری نبیؐ کے ظہور کے قائل تھے اور لوگوں کو بتاتے تھے کہ آخری نبیؐ کے ظاہر ہونے کا زمانہ قریب ہے۔

آخری نبی اور رسول حضرت محمدؐ کی آمد کی بشارت ہر پیغمبر نے اپنی امت کو دی ہے۔ ابتدا سے یہ پیغام انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے ایک امت سے دوسری امت کو منتقل ہو رہا ہے کہ ایک نبی آئے گا جس کے ظہور سے دین کی تکمیل ہو گی۔

حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے فرمایا،

”میں اُن کے لئے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا، وہی وہ اُن سے کہے گا۔“

(توریت کتاب: استثنا، باب ۱۸، آیت ۱۸)

* حرب وضرب (جنگ وجدل)

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا،

''اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیوں کہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔''

(انجیل یوحنا: باب ۱۴، آیت ۳۰)

آخری آسمانی کتاب قرآن کریم میں ہے،

''لوگو! محمدؐ تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیینؐ ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔'' (الاحزاب: ۴۰)

دیگر قبائل کی طرح بی بی بسیرہؓ کے قبیلے کے لوگ یہودی و عیسائی راہبوں سے آخری نبیؐ کی بعثت کی باتیں سنتے کہ ان کا زمانہ قریب ہے تو حیران رہ جاتے، متجسس ہوتے اور واپس جا کر، جو سنا، اپنے قبیلے کے لوگوں کو بتاتے۔

عرب قبائل میں قبیلۂ قریش کا مقام و احترام تھا۔ لوگ ان کی بات سنتے اور رائے کا احترام کرتے تھے۔ بی بی بسیرہؓ کے قبیلے کے ایک شخص نے جو سامانِ تجارت فروخت کر کے شام سے واپس آیا تھا، لوگوں کو بتایا کہ میں ایک راہب سے سن کر آیا ہوں کہ عرب کی زمین پر ایک پیغمبر ظاہر ہوگا اور اس کا تعلق قریش سے ہوگا۔ مختصر یہ کہ جیسے جیسے پیغمبرِ آخر الزماں، خاتم النبیین حضرت محمدؐ کے مبعوث ہونے کا زمانہ قریب آیا، یہ باتیں پھیلتی گئیں۔

رسول اللہؐ کے دنیا میں ظاہر ہونے کے بعد ملک شام سے تعلق رکھنے والے بحیرا راہب کا واقعہ بھی مشہور ہے جب اس نے دیکھا کہ تجارتی قافلے میں موجود ''ایک بچے'' کی تعظیم میں شجر و حجر جھک گئے اور سحاب* نے سایہ کیا۔

محبوبِ رب العالمین، خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہؐ کے عاشقِ صادق، عظیمی صاحبؒ نے اپنی تالیف ''خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہؐ، جلد اول'' میں یہ واقعہ تحریر فرمایا ہے،

''پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب ایک تاجر تھے۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہ سال کی عمر میں شام لے گئے۔ شام کے شہر ''بصرہ'' کے نزدیک ان کا کارواں ٹھہرا۔ جس جگہ کارواں نے پڑاؤ کیا، وہاں ایک صومعہ* میں بحیرا نامی راہب رہتا

---

* سحاب (بادل، بادلوں) * صومعہ (راہبوں کی کٹیا)

تھا۔ سریانی زبان میں بحیرا کے معانی بزرگ اور دانشور کے ہیں۔ بحیرا نے اس دن تک اپنے صومعہ سے باہر قدم نہیں نکالا تھا اور نہ کسی کارواں کے مسافر سے گفتگو کی تھی۔ عربوں کا یہ تجارتی قافلہ جب صومعہ کے قریب فروکش* ہوا تو بحیرا نے دیکھا کہ جس درخت کے نیچے قافلے والے ٹھہرے ہیں، اس کی ٹہنیاں خود بخود جھک گئی ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک بارہ سالہ لڑکا قافلے میں شامل ہے جس پر بادل کا ٹکڑا سایہ کئے ہوئے ہے۔ بحیرا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت آخری نبی پہچان کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرپرست ابو طالب کو نصیحت کی کہ اپنے بھتیجے کی پوری پوری نگرانی کریں۔ ابو طالب نے کہا کہ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ بچہ وہی ہے جس کا تذکرہ الہامی کتابوں میں ہے؟ بحیرا نے جواب دیا، تم لوگ جب گھاٹی کے اس جانب نمودار ہوئے تو کوئی بھی درخت یا پتھر ایسا نہیں تھا جو سجدے کے لئے جھک نہ گیا ہو۔"

رسول اللہؐ کی صورت میں کائنات پر رحمتِ الٰہی سایہ فگن ہوئی اور آپؐ نے نبوت کا اعلان فرمایا۔ بی بی بسیرہؓ ان دنوں طائف میں تھیں۔ خبر قریب دور پھیلتی گئی کہ قریش کے (حضرت) محمدؐ بن عبد اللہ نے نبوت کا اعلان کیا ہے اور وہ لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے ہیں۔

بی بی بسیرہؓ تک بھی خبر پہنچی۔ پیغامِ رسالتؐ کے بارے میں جاننے کی جستجو پیدا ہوئی اور اس نتیجے پر پہنچیں کہ آپؐ صادق و امین ہیں۔ جب یقین ہوا کہ حضرت محمدؐ کی دعوت حق ہے اور وہ اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں، انہوں نے خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔

بی بی بسیرہؓ — ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے گھر تشریف لے گئیں، سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئیں۔ رسول اکرمؐ متوجہ ہوئے اور آنے کا سبب دریافت فرمایا۔ کتاب "60 باکمال خواتین" میں اس گفتگو کا احوال کچھ اس طرح ہے۔

حضرت بسیرہؓ نے عرض کیا کہ چند سوالات کے جواب جاننا چاہتی ہوں۔

رسول اللہؐ نے اجازت دی۔

عرض کیا، اسلام کیا ہے؟

---

* فروکش ہونا (ٹھہرنا، قیام کرنا)

رسول اللہؐ نے فرمایا، اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو سچا ماننے اور ان پر ایمان لانے کا نام اسلام ہے۔

عرض کیا، آپؐ لوگوں کو کیا تعلیم دیتے ہیں؟

رسول اللہؐ نے فرمایا، یہ کہ کسی پر ظلم نہ کرو، مظلوم کی مدد کرو، ہمسائے کا خیال رکھو، اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، وہ دوسروں کے لئے بھی پسند کرو، سچ بولو، جھوٹ نہ بولو، اللہ کو ایک مانو اور اس کے رسولؐ کی تابع داری کرو۔

حضرت بسیرہؓ ایمان لے آئیں۔

قبولِ اسلام کے بعد صحابیہ حضرت بسیرہؓ کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا — ایسا دور جس میں ایک طرف رسول اللہؐ سے نسبت و محبت تھی جو دنیا کے ہر رشتے سے معتبر تھی اور دوسری طرف آزمائشیں اور مشکلات۔ اہلِ خانہ، عزیز و اقارب اور پڑوسی دشمنی پر اتر آئے۔ کھانا پینا مشکل کر دیا۔ جسمانی اذیتیں دی گئیں تاکہ وہ رسول اللہؐ کا ساتھ چھوڑ دیں لیکن انتہائی مضبوط اعصاب کی مالکہ تھیں، ہمت، صبر اور حوصلے سے سختیوں کا سامنا کیا۔

یہ وہ دور تھا جب مشرکینِ مکہ نے توحید کے پیغام کی ترویج سے روکنے کے لئے رسول اللہؐ کو انتہائی حد تک تکالیف اور اذیتیں پہنچائیں۔ ان پر ایمان لانے والوں پر بھی عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ تاریخ کی کتب ان تکلیف دہ واقعات سے بھری پڑی ہیں۔

ان واقعات میں جو پہلو سب سے اہم، قابلِ قدر اور قابلِ تفکر ہے، وہ یہ کہ ایمان لانے والے خواتین و حضرات جن کے قلوب اللہ اور خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی محبت سے منور ہوئے، وہ ثابت قدم رہے۔ اللہ اور اس کے حبیبؐ سے محبت ان کی قوت بن گئی۔

ایک روز رشتہ داروں اور اہلِ محلہ نے بی بی بسیرہؓ پر تشدد کیا تو انہوں نے فرمایا،

> ”کیا تم مجھے اس لئے اذیت دے رہے ہو کہ میں حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئی ہوں اور میں نے رسول اللہؐ کی اطاعت قبول کر لی ہے؟ جان لو! اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمدؐ، اللہ کے رسول ہیں اور ان کی اطاعت فرض ہے۔ اسلام میرے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے۔ موت قبول

ہے، یہ برداشت کر سکتی ہوں کہ تم لوگ میرے ٹکڑے کر کے جلادو لیکن رسول اللہؐ کی تعلیمات سے منہ موڑنا قبول نہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے، ان کی باتیں سنی ہیں اور جانتی ہوں کہ وہ سچے نبیؐ ہیں۔ جو چاہے کرو، دل میں جو بات راسخ ہو چکی ہے، میں اس پر قائم ہوں۔''

صحابیہ حضرت بسیرہؓ کا عزم و استقلال دیکھ کر رشتہ داروں کے دل میں نرمی پیدا ہوئی۔ بعض نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ کچھ ان سے متاثر ہوئے اور سوچا کہ رسول کریمؐ کے پیغام میں ضرور ایسی بات ہے کہ جو اس پیغام کو قبول کرتا ہے — جاں نثار ساتھی بن جاتا ہے۔ کچھ رشتہ داروں نے ان سے معافی مانگی، توحید کے پیغام کو قبول کیا اور ان کے معاون بن گئے۔

جب مشرکینِ مکہ کے مظالم بہت بڑھ گئے اور مسلمانوں کے لئے مکہ مکرمہ میں رہنا دشوار کر دیا گیا تو بارگاہِ الٰہی سے ہجرتِ مدینہ کا حکم ہوا۔ حضرت بسیرہؓ اور ان کا خاندان بھی ہجرت کرنے والوں میں شامل تھا۔ اس خاندان نے مدینہ منورہ پہنچ کر توحید کے مشن کے فروغ کے

> ایسے شخص کی خدمت کیجئے جو نادار ہے پھر دیکھئے کہ آپ کو کتنا سکون ملتا ہے۔ دوسروں کی مدد کرنا اور ان کے کام آنا انسانیت کی معراج ہے اور یہی وہ مشن ہے جس کو عام کرنے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں تشریف لائے۔
>
> (کتاب: کشکول)

لئے دوسرے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کام کیا اور خدمات انجام دیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت بسیرہؓ اور ان کا خاندان جنگِ بدر اور احد کے علاوہ کئی معرکوں میں شریک ہوا۔

صحابیہ حضرت بسیرہؓ ان عظیم خواتین میں شامل ہیں جن کا عزم، استقامت، بصیرت اور قربانی ہمارے لئے مثال ہے۔

قارئین کرام! دورِ نبویؐ ایثار اور جاں نثاری کے واقعات سے بھرپور ہے جس میں مردوں کے ساتھ خواتین نے بھی بہادری کی عظیم مثالیں قائم کیں۔ اس دور کے واقعات پڑھ کر اندر میں احساس پیدا ہوتا ہے کہ جس کے دل میں رسول اللہؐ کی محبت جاگزیں ہوئی، اس نے ہر مشکل کا بہادری سے سامنا کیا اور جان و مال سے رسول اللہؐ کے مشن کے لئے خود کو پیش کیا۔

چہرہ اسکرین ہے

محبت پُرسکون زندگی اور اطمینانِ قلب کا ایک ذریعہ ہے اس لئے کوئی انسان جس کے اندر محبت کی لطیف لہریں دور کرتی ہیں، وہ مصائب و مشکلات اور پیچیدہ بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کے چہرے میں ایک خاص کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس نفرت کی کثیف، شدید اور گرم لہریں انسانی چہرے کو جھلس دیتی ہیں اور دماغ کو اتنا بوجھل اور تاریک کر دیتی ہیں کہ زندگی میں کام آنے والی لہریں مسموم اور زہریلی ہو جاتی ہیں۔ اس زہر سے انسان طرح طرح کے مسائل اور قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نفسیات داں یہ بات جانتے ہیں کہ ہر انسان روشنیوں سے مرکب ہے اور روشنی کی یہ لہریں انسان کی ہستی سے غیر محسوس طریقے پر نکلتی رہتی ہیں۔ کوئی چہرہ ہمارے سامنے ایسا آتا ہے کہ ہم اس چہرے کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں اور کوئی چہرہ ہمارے سامنے ایسا بھی آتا ہے کہ ہم اس چہرے میں سے نکلنے والی لہروں سے بیزار ہو جاتے ہیں۔

جن لوگوں کے دل اللہ کے نور سے معمور ہوتے ہیں اور جن لوگوں کے دماغ میں خلوص، ایثار، محبت، پاکیزگی اور خدمتِ خلق کا جذبہ ہوتا ہے، ایسے لوگوں کے چہرے بھی خوش نما، معصوم اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ ان چہروں میں ایسی مقناطیسیت ہوتی ہے کہ ہر شخص قریب ہونا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس ایسے لوگ جو احساسِ گناہ کے اضطراب میں مبتلا ہیں، ان کے چہروں پر خشونت، خشکی، یبوست (روکھا پن)، بے آہنگی اور کراہت کے تاثرات پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ تاثرات دوسرے آدمی کے دل میں دور رہنے کا تقاضا پیدا کرتے ہیں۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل کی فلم بنتی رہتی ہے اور ہر آدمی کی اپنی اس فلم کے لئے اس کا اپنا چہرہ اسکرین ہے۔ کراماً کاتبین کی بنائی ہوئی فلم انسانی چہرے پر چلتی رہتی ہے۔

نیرّ اعظم

گم شدہ شہر

قافلہ ”بکائی ری“ پوسٹ کی طرف رواں تھا جسے لوگ تہذیبوں کی آخری حد کہتے تھے۔ اس سے آگے کا علاقہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

کتابوں اور کہانیوں میں ایسے شہر یا تہذیبوں کا ذکر ہے جن کے بارے میں چند لوگوں نے لکھا، مہم جُو تلاش میں نکلے، فلمیں بنیں، مزید کتابیں لکھی گئیں — مگر یہ علاقے کسی کو نہیں ملے۔ کچھ نے ان کو افسانوی کہا اور کچھ نے لکھا کہ اگر یہ افسانے ہیں تو بھی درپردہ کوئی حقیقت ہے جس کی وجہ سے ان کا ذکر عام ہوا۔

گم شدہ شہروں اور داستانوں نے بہت سے مہم جُوؤں کو نامعلوم سے معلوم تک پہنچنے کی تحریک دی۔ وہ ان شہروں کی تلاش میں نکلے، خطرناک راستوں سے گزرے لیکن ناکام واپس آئے یا ان شہروں کی طرح گم ہو گئے۔

ان مہم جُوؤں میں ایک نام لیفٹیننٹ کرنل پرسی ہیریسن فاسیٹ کا ہے جو سپاہی، نقشہ ساز، ماہرِ جنگلات، آثارِ قدیمہ کا ماہر اور مہم جُو تھا۔ 18 اگست 1867ء کو برطانیہ میں پیدا ہوا۔ وہ ایسے خاندان سے تھا جس کا رجحان تحقیق، مہم جوئی، علوم بالخصوص جغرافیہ کی طرف تھا۔ اس نے رائل آرٹلری میں خدمات انجام دیں پھر رائل جیوگرافیکل سوسائٹی سے نقشہ سازی کی تربیت حاصل کی — سخت جان، مضبوط اعصاب اور خطرات سے نہ گھبرانے والے فاسیٹ نے کئی مہمات سر کیں — ایمیزون کے جنگلات میں گم شدہ شہر ”زی“ کی مہم جُوئی پہچان بنی۔

دنیا کے سب سے بڑے اور گھنے جنگلات، ایمیزون نے ہمیشہ مہم جُوؤں کے ذہنوں پر دستک دی ہے۔ یہاں لاکھوں اقسام کے جانور، پودے، پرندے، مچھلیاں اور حشرات پائے جاتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ یہ دنیا کا سب سے زیادہ

حیاتیاتی تنوّع رکھنے والا علاقہ ہے ۔ علاوہ ازیں یہاں بہت سے قبائل آباد ہیں اور ایسے گھنے اور تاریک حصے بھی ہیں جو محققین کی رسائی سے دور ہیں۔ یہ جنگلات تقریباً 55 لاکھ مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سرحدیں آٹھ ممالک سے ملتی ہیں۔ سب سے زیادہ رقبہ برازیل کی حدود میں ہے۔

1906ء میں فاسیٹ کو برازیل اور بولیویا کے سرحدی جنگلات کی نقشہ سازی کا کام سونپا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اسے ایمیزون کے جنگلات سے عشق ہو گیا۔ بعد ازاں اس نے کئی مہمات سر انجام دیں جن میں وہ نئے علاقے دریافت کرتا، جانوروں کی اقسام نوٹ کرتا اور مقامی قبائل سے ملاقات کرتا۔

فاسیٹ نے جنوبی امریکا کے متعدد دورے کئے۔ 1920ء کی دہائی میں قدیم دستاویزات، پرتگالی نو آبادیاتی ریکارڈ اور مقامی کہانیاں سن کر خیال آیا کہ یقیناً ایمیزون کے گھنے جنگلات میں ایک قدیم اور ترقی یافتہ شہر کے نشانات ہیں۔ اس نے جو پڑھا اور سنا تھا، اس کی بنیاد پر اس شہر کے بارے میں نظریہ قائم کیا کہ یہ شہر وسیع سڑکوں، عبادت گاہوں اور سہولیات سے آراستہ تھا اور ممکن ہے کہ ماضی کے کسی دور میں تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہو۔ اس نے اس شہر کو "زی" کا code دیا۔ یہ گم شدہ شہر "زی" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

جب 1906ء میں ایمیزون کے جنگلات میں نقشہ سازی کے لئے پرسی فاسیٹ کا انتخاب ہوا تو اسے مطلع کیا گیا کہ گھنے درختوں میں گھرے ہوئے علاقے کی پُراسراریت، پُرخطر راستوں، وہاں موجود جانوروں اور ان جنگلات میں آباد قبائل کی وجہ سے یہ کام خطرات سے پُر ہے لیکن اس نے ہچکچائے بغیر مہم قبول کی۔ بیگم نینا اور تین سالہ بیٹے جیک کو الوداع کہہ کر چند گائیڈ اور ضروری سامان کے ساتھ روانہ ہوا۔

جب وہ سیکڑوں میل کے سفر میں پہاڑوں، جوہڑوں اور جنگلوں سے گزرا تو ایک مقام پر دھواں اور درختوں میں پیوست تیر نظر آئے۔ ایسا لگا کہ کوئی چھپ کر ان کو دیکھ رہا ہے۔ مشہور تھا کہ اس جگہ کے قبائلی اجنبی کو آنے نہیں دیتے، غلام بنا لیتے ہیں یا—؟

ماتو گروسو

پرسی فاسیٹ کو یقین تھا کہ یہ لوگ ایسا کسی خوف کی بنا پر کرتے ہیں، خوف دور کر کے ان سے دوستی کی جاسکتی ہے۔ ساتھ موجود لوگوں کو گولیاں چلانے سے منع کیا۔ ایک موقع پر جب قبائلیوں نے ان پر تیر برسائے تو فاسیٹ نے سامان میں موجود آلاتِ موسیقی بجا کر گانا شروع کر دیا۔ ایک اور موقع پر وہ دونوں ہاتھ اوپر کر کے قبائلیوں کے قریب گیا تا کہ اپنے پُرامن ہونے کا یقین دلائے۔ ان اقدامات کی وجہ سے فاسیٹ کی پوری ٹیم 18 مہینے میں کام مکمل کر کے بحفاظت واپس ہوئی۔

وقت گزرتا رہا۔

ایک روز برازیل کے ساحلی شہر ریوڈی جینیرو (Rio de Janeiro) میں پرانی کتب کے ذخیرے کا جائزہ لیتے ہوئے ایک کتاب ملی جو 1753ء میں دریافت ہونے والے قدیم شہر کے تاریخی جائزے سے متعلق تھی۔ اس شہر کے آثار رہ گئے تھے۔ یہ کسی پُرتگالی مہم جُو نے لکھی تھی۔ اس کتاب میں برازیل کی ریاست "ماتو گروسو" (Mato Grosso) میں ایسے شہر کا ذکر تھا جہاں کئی منزلہ عمارتیں تھیں، چاندی بکثرت استعمال ہوتی تھی۔ شہر کی چاروں طرف فصیل تھی۔ پرسی فاسیٹ نے مزید معلومات حاصل کر کے اسے "گم شدہ شہر — زی" کا نام دیا۔ وہ مہم پر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔ آخرکار 1921ء میں ٹیم کے ساتھ گم شدہ شہر کی تلاش میں نکلا۔ جنگل کی سختیاں، خطرناک جانور اور بیماریاں رکاوٹ بن گئیں۔ وہ کئی بار اس شہر کی تلاش میں نکلا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے واپس آنا پڑا۔

پرسی فاسیٹ کی عمر 58 برس ہو چکی تھی۔ 20 اپریل 1925ء کو ایک مرتبہ پھر عالمی اداروں

کے تعاون سے مہم پر روانہ ہوا۔ کئی اداروں کو سفر کی تفصیلات بھیجنے کا معاہدہ بھی کیا۔ اس مہم کی روداد اُن خطوط اور لوگوں کے ذریعے منظر عام پر آئی جو اُس کے ہمراہ تھے اور کسی وجہ سے مہم چھوڑ کر واپس آنا پڑا تھا۔

اس مرتبہ بیٹا جیک جو 22 سال کا ہو گیا تھا، جیک کا دوست رالی رمل، گائیڈ، دو مزدور، آٹھ گدھے، دو گھوڑے اور دو کتّے ہمراہ تھے۔

آغاز نسبتاً پُرسکون تھا۔ پہلے دن سات اور اگلے دن دس میل چلے جس کے بعد کیمپ لگا کر قیام کیا۔ مچھر دانیاں لگائیں۔ بیوی اور اخبارات کو خط میں تفصیلات لکھیں۔ گرمی کی شدت کے بارے میں ایک خط میں لکھا،

"دریا کیا با میں مچھلیاں زندہ بھن گئیں۔"

وہ اس مہم کے لئے کتنا پُرجوش تھا، اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب یہ لوگ دریائے مانسو پہنچے تو بیٹا اور اس کا دوست بچھڑ گئے۔ بیٹے نے ایک خط میں لکھا،

"والد اتنی تیزی سے آگے گئے کہ ہم ان کا ساتھ نہیں دے سکے۔"

صبح فاسیٹ ان لڑکوں تک پہنچ گیا۔ یہ علاقہ ٹِک نامی چھوٹے کیڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ کیڑے نے رالی رمل کے پیر پر کاٹ لیا۔ پیر سوجنے سے چلنا دشوار ہو گیا۔ فاسیٹ رک گیا اور پانچ دن جانوروں کے فارم پر گزارے۔

فارم کے مالک نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ پرسی فاسیٹ کے پاس تقریباً 10 انچ لمبا مجسمہ تھا جسے وہ کپڑے میں لپیٹ کر رکھتا تھا، آنکھیں بادامی تھیں اور سینے پر قدیم زبان میں کچھ کندہ تھا۔ یہ فاسیٹ کو کسی نے دیا تھا۔ اس کے مطابق یہ "زی" شہر کی نشانی تھی۔

قافلہ "بکائی ری" پوسٹ کی طرف رواں تھا جسے لوگ تہذیبوں کی آخری حد کہتے تھے۔ اس سے آگے کا علاقہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ جنگل گھنے سے گھنا ہوتا گیا۔ کیچڑ سے بھری کھائیوں اور تیز بہتے دریاؤں سے گزرنا پڑا۔ دریا میں چھوٹے بڑے پتھر راستہ بن گئے تھے۔ پانی میں اترنے سے پہلے کھال کو اچھی طرح دیکھتے کہ خون کا دھبّہ نہ ہو ورنہ پیرانہا جیسی خطرناک مچھلیاں بو سونگھ لیتیں۔ ان پریشانیوں سے گزرتے ہوئے 30 دن رات کے بعد یہ لوگ بکائی ری پوسٹ پہنچے۔ یہاں تک کہ سفر

کو فاسیٹ نے ایک خط میں، ”خوفناک حد تک مشکل راستہ“ لکھا لیکن اس جگہ نے ان کے لئے امید کی کرن پیدا کی۔

بکائی ری قبیلہ (Bakairi) اس علاقے کا پہلا قبیلہ ہے جسے موجودہ تہذیب سے روشناس کرنے کی سرکاری کوششیں کی گئی تھیں۔ یہ جنوبی امریکا میں ایمیزون کے جنگلات میں آباد ہے جو برازیل کی ریاست ماتو گروسو کی حدود میں آتا ہے۔

جنگلات میں دور دراز قبیلوں کے افراد یہاں آتے جاتے تھے۔ کچھ افراد سے مل کر جیک اور اس کا دوست رالی رمل پُرجوش ہوگئے کیوں کہ وہ لوگ آگے کے سفر میں مدد کرسکتے تھے، مہم کی کامیابی کی امید بڑھ گئی تھی۔

جیک نے دوسرے قبیلے سے آئے ہوئے آٹھ لوگوں کو دیکھا۔ ہاتھوں میں سات فٹ کی کمان اور چھ فٹ کے تیر تھے۔ وہ نہ صرف ان سے ملا بلکہ تصویریں بھی کھنچوائیں۔ رات میں یہ تینوں ان قبائلیوں کے خیمے میں گئے اور اپنے پاس موجود موسیقی کے آلات بجائے۔

19 مئی کی صبح جیک خوشی خوشی بیدار ہوا، اس کی 22 ویں سالگرہ تھی۔ والدہ کو لکھا،

”میں نے آج سے پہلے اتنا اچھا کبھی محسوس نہیں کیا۔“

انہوں نے بکائی ری سے شمال کی طرف جانے کی تیاری کی جہاں کئی پہاڑ نظر آئے۔ جیک کا کہنا تھا کہ ان پہاڑوں کے پیچھے ایک نامعلوم شہر یا ملک ہے۔

پرسی فاسیٹ نے بیوی نینا کو لکھا،

”میں کسی عظیم دریافت کی دہلیز پر ہوں۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ شہر جسے میں Z کہتا ہوں، علم اور تاریخ کا نیا دروازہ کھولے گا۔“

وہ ایسے علاقے میں داخل ہوچکے تھے جس کے راستے کسی کو معلوم نہیں تھے۔ جنگل مزید گھنا ہوگیا تھا۔ تقریباً 150 فٹ اونچے درختوں سے چھن کر جب سورج کی روشنی زمین پر پہنچتی تو دن — رات بن جاتا تھا۔ پودوں کی ٹہنیاں اور جڑیں جگہ جگہ رکاوٹ بنیں، سخت گرمی اور ڈنک مارنے والے کیڑے جن میں سے بعض کے ڈنک اتنے زہریلے تھے کہ جِلد پر دانے نکل آئے۔ خون پینے والی چمگادڑیں، بچھو اور اژدہے بھی تھے۔ اتنی مشکلات پیش آئیں کہ

فاسیٹ کے ایک خط کے مطابق اسے احساس ہوا کہ عمر کے اعتبار سے وہ اس علاقے میں دیر سے آیا ہے کیوں کہ 58 سال کے آدمی کے لئے ایسے علاقے سے گزرنا بہت مشکل ہے۔

اس جگہ ایسی مکھی موجود تھی جو بہت تیزی سے حرکت کرتی اور مچھر کی طرح کاٹتی تھی لیکن اتنی چھوٹی کہ مچھر دانیاں روکنے میں ناکام تھیں۔ یہاں سے آگے جنگل بہت گھنا تھا۔ وہ لوگ اس قدر سامان ساتھ لے جاسکتے تھے جو کمر پر رکھے بیگ میں آسکے۔ وہاں فاسیٹ نے کئی خطوط گھر اور اداروں کے لئے لکھے پھر برازیلی گائیڈز کے حوالے کرکے قافلے میں موجود جانوروں سمیت انہیں واپس بھیج دیا۔ جیک کے دوست رالی رمل کے پیر میں سوجن باقی تھی لیکن پرسی کے اصرار کے باوجود اس نے واپس جانے سے انکار کردیا۔

پرسی فاسیٹ نے مددگاروں سے کہا کہ وہ آنے والے سالوں میں کچھ باتیں بتائے گا لیکن خدشہ ظاہر کیا کہ شاید ایسا نہ ہوسکے۔

گائیڈز کو الوداع کہہ کر یہ لوگ گھنے جنگل میں داخل ہوگئے۔ اس کے بعد وہی ہوا جو اس نے ایک ادارے کو خط میں لکھا تھا،

”جب یہ معلومات شائع ہوں گی، ہم کسی نامعلوم کے اندر غائب ہوچکے ہوں گے۔“

پرسی فاسیٹ اور اس کے دو ساتھیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی مگر ”گم شدہ“ شہر ”زی“ کی طرح وہ بھی گم ہوگئے۔

؎ وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

ماتو گروسو

♦ ماتو گروسو کا جنگل دس کروڑ ایکڑ سے زیادہ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں بارش کے بعد پانی بہت تیزی سے زمین میں جذب ہوتا ہے۔ بارش رکتے ہی زمین خشک ہوجاتی ہے۔

♦ یہاں rodents کی کم و بیش 46 اور چمگادڑوں کی 52 اقسام کے علاوہ سیکڑوں قسم کے پرندے، موذی حشرات، لاشمار تتلیاں، بڑی چھپکلیاں اور بہت سے چھوٹے بڑے جانور ہیں۔

♦ ماتو گروسو کے دلدلی علاقے پانتانال میں نیشنل پارک ہے۔ پانتانال دنیا کا سب سے بڑا دلدلی نظام بتایا جاتا ہے۔ یہ یونیسکو کے عالمی ورثے میں شامل ہے اور نایاب جنگلی حیات کا مسکن ہے۔

بلال حسن

برف پانی

آدمی صدیوں سے تلاش میں ہے کہ میں کون ہوں، جسم کیا ہے، میں اگر جسم نہیں ہوں تو پھر یہ سوال پوچھنے والا کون ہے، کائنات کس مقام پر ہے اور اس میں، میں کہاں ہوں؟ سادہ الفاظ سے مرکب گہرے سوالات خود شناسی اور کائنات کی حقیقت کو جاننے کا زینہ ہیں۔

ہم جسمانی ساخت کو اپنی شناخت سمجھ لیتے ہیں لیکن کیا یہ شناخت ہے؟ شناخت جسم سے ہے تو یہ ہر آن گھٹتا بڑھتا کیوں ہے اور موت کے بعد مٹی میں تحلیل ہو جاتا ہے؟ وہ میں جو محسوس کرتی ہے، سوچتی ہے، دیکھتی ہے، دکھاتی ہے، سوال کرتی ہے، خود کو تلاش کرتی ہے — کہاں چلی جاتی ہے؟

اپنی تلاش میں کوہ و دمن کی خاک چھاننے والے ایک شخص کی کسی مکتب میں درویش سے ملاقات ہوئی۔ بتایا کہ سفر میں ہوں، یہ جاننے کے لئے کہ میں کون ہوں۔

درویش نے کمرے میں اندھیرا کیا۔ موم بتی جلائی اور بجھا دی۔ مسافر سے کہا، یہ روشنی تھی جو موم میں نظر آئی۔ روشنی چھپتے ہی موم اوجھل ہو گیا۔ پھر جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جسم بھی موم بتی ہے۔ روشنی یا کرنٹ اس سے منقطع ہو گا تو کیا رہے گا —؟

روشنی بکھرتی ہے تو عناصر مرکب حالت سے آزاد ہو کر اصل حالت میں لوٹ جاتے ہیں۔ پانی پانی میں، مٹی مٹی میں، ہوا فضا میں اور آگ اپنی فطرت میں جذب ہو جاتی ہے۔ یہ عناصر سے مرکب جسم کی موت ہے، عناصر کی نہیں، عناصر تو اپنی اصل کی طرف لوٹ گئے۔ سوال یہ ہے کہ جب عناصر بکھرتے ہیں تو میں کہاں چلی جاتی ہے؟ کیا میں عناصر کا حصہ ہے؟ اگر ایسا ہے تو عناصر کے اصل کی طرف لوٹتے ہی میں کہاں گئی؟ میں کیا ہے اور کہاں ہے؟

آپ نے بچپن میں کھیل ''برف پانی'' کھیلا ہے ؟ برف جم جاتی ہے اور پانی رواں رہتا ہے، بہتا ہے۔ اگر برف پانی نہیں کھیلا تو برف ضرور دیکھی ہے۔ برف پہلے پانی (مائع) ہوتا ہے، پانی گیس اور گیس تصورات کا مجموعہ۔ درجۂ حرارت میں کمی سے پانی جم کر برف بنتا ہے۔ برف کی حالت مستقل نہیں، حرارت میں مثبت اضافے سے وہ دوبارہ مائع حالت میں آجاتی ہے۔

پانی کو کھلی فضا میں زمین پر ڈالیں۔ سورج کی تمازت اسے خشک کر دیتی ہے — ختم نہیں کرتی — خشک کرتی ہے۔ اسی طرح جسم بھی وقت کے ساتھ گھٹتا بڑھتا اور غائب ہوتا ہے، ختم نہیں ہوتا، اس کا تشخص مٹی کے ذرّات میں چھپ جاتا ہے لیکن سوال موجود رہتا ہے کہ میں کون ہوں — بشرطیکہ وہ بکھرنے سے پہلے خود سے واقف نہ ہوا ہو۔

اپنی تلاش فرد کو خود سے ملا دیتی ہے۔ وہ ظاہر کے تار اُدھیڑ کر باطن میں دیکھتا ہے۔ جسم کے اندر اس روشنی کو تلاش کرتا ہے جس کے کرنٹ نے بلب کی طرح مٹی کے خول کو روشن رکھا ہے جیسے کرنٹ دَور کرنے سے بلب روشن ہوتا ہے اور جب کرنٹ منقطع ہو جائے تو بلب کا تعارف سوالیہ نشان ہے۔

''دنیا باہر ہے۔'' کے فریب میں مبتلا شخص اندر نہیں دیکھتا اور ایسا کر کے اپنے ساتھ ساتھ دنیا سے بھی بے خبر رہتا ہے۔

جب فرد سوال کرتا ہے کہ میں کون ہوں تو اندر میں سے جواب آتا ہے کہ تم وہ ہو جو یہ سوال پوچھ رہا ہے۔ سوال کون پوچھ رہا ہے، اسے تلاش کرنا تمہارا کام ہے۔ راستہ بتایا جاسکتا ہے لیکن خود شناسی کا سفر خود طے کرنا ہے۔ جیسے شہد چکھے بغیر معلوم نہیں ہوتا کہ ذائقہ کیسا ہے، چاہے بیان کرنے والا سادہ سے سادہ الفاظ میں کیوں نہ بیان کرے، اسی طرح اپنی حقیقت کا ادراک تجربے اور محسوس کرنے سے ہوتا ہے۔ خود شناسی کے لئے خود کو ظاہر سے ماورا دیکھنا ہے۔ مثلاً درخت کو دیکھتے وقت قد و قامت اور رنگ تک خود کو محدود نہ کریں، اس کے اندر میں دیکھیں۔ یہی اصول ہم پر لاگو ہوتا ہے کہ ہم جسم کو میڈیم سمجھ کر اس کے پیچھے موجود حقیقت کو پہچانیں۔

360 ڈگری

ہماری سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ ہم نے الوژن طرز فکر کو میڈیم بنالیا ہے اور خود کو اس کے تابع کر دیا ہے اس لئے ہمیں الٹی شے سیدھی اور سیدھی شے الٹی نظر آتی ہے۔

ہم دیوار کے سامنے کھڑے ہیں، پشت کی جانب سے روشنی آرہی ہے، روشنی جسم سے ٹکراتی ہے تو دیوار پر عکس بنتا ہے جو ہماری جسامت سے بڑا ہوتا ہے اور بایاں ہاتھ عکس کا دایاں ہاتھ نظر آتا ہے۔ یہی صورت آئینے میں دیکھنے کی ہے۔ شیشے کے پیچھے مسالا لگا کر آئینہ بنایا جاتا ہے۔ مسالا پہلے سیندور یا پارے کا ہوتا تھا، اب دوسرے کیمیائی مادے استعمال ہوتے ہیں جو روشنی کو منعکس کر کے آئینے میں شے کا عکس دکھاتے ہیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوں۔ آئینے نے عکس کو جذب کیا اور اس کے پیچھے لگے مسالے نے ہماری شبیہ (عکس) کو پلٹ دیا۔ الٹ پلٹ کے نتیجے میں دایاں ہاتھ آئینے میں بایاں ہاتھ نظر آیا۔

زمین بھی آئینہ ہے۔ آئینے کے ایک طرف مسالا روشنی کو پلٹا کر یا انعکاس کر کے تصویریں دکھاتا ہے، زمین کی سطح کی دوسری طرف مسالا بھی یہی ذمہ داری انجام دے رہا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''اور یہ جو رنگ رنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کی ہیں، ان میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانی ہے۔''

(النحل: ۱۳)

روشنی (شعاع) زمین سے ٹکراتی ہے تو آر پار نہیں ہوتی بلکہ سطح پر بکھرتی ہے۔ بکھرنے سے شعاع میں مخفی رنگ ظاہر ہوتے ہیں۔ رنگوں کی آمیزش عکس بن جاتی ہے اور ہم عکس کے دیکھنے کو دیکھتے ہیں۔

جب دیکھنے کی بات ہوتی ہے تو لامحالہ دیکھنے کا

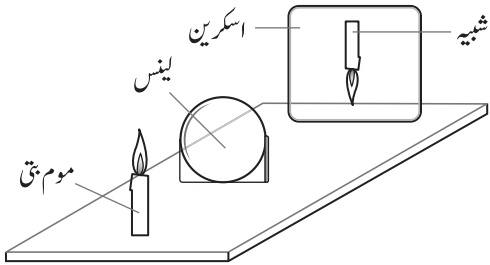

تصویر میں پنوں کی جگہ موم بتی ہے۔ میکانزم کی وضاحت کے لئے ایک موم بتی کی قائم مقام اسکرین ہے۔

طریقِ کار یا میکانزم زیرِ بحث آتا ہے۔

ہماری آنکھ میں محدّب عدسہ* لگا ہوا ہے۔ یہ لینس شے کی تصویر کو لہروں کی صورت میں ریٹینا(retina) پر منتقل کرتا ہے تو اس دوران دو عمل وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

۱۔ دونوں آنکھوں کے لینس سے شے کی الگ الگ تصویریں ریٹینا پر جمع ہوتی ہیں۔ ریٹینا ان کو مجتمع کر کے ایک دکھاتا ہے۔

۲۔ محدّب عدسے کی خاصیت ہے کہ یہ شے کے عکس کو الٹا دکھاتا ہے لہٰذا ریٹینا پر شبیہ الٹی یعنی Upside Down بنتی ہے۔ جب الٹی شبیہ لہروں کی شکل میں دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتی ہے تو ذہن لہروں کو اس طرح معنی پہناتا ہے کہ شے سیدھی (Upright) نظر آتی ہے۔

دسویں کلاس میں طلبہ کو 2 Pin Method کا تجربہ کروایا جاتا ہے۔ معین فاصلے پر دو پنیں رکھی جاتی ہیں۔ دونوں کے درمیان میں محدّب عدسہ ہوتا ہے۔ جب ایک طرف سے لینس میں دیکھا جاتا ہے تو دوسری طرف موجود پن لینس میں الٹی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دونوں پنوں کی نوکیں لینس میں ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مشق: پن کی جگہ شمع رکھئے۔ محدّب لینس کے دونوں اطراف شمع روشن کیجئے۔ شمعیں ایک سیدھ میں روشن ہیں۔ جیسے ہی محدّب عدسے کے دیکھنے کو دیکھتے ہیں، لینس کی دوسری طرف کی شمع لینس میں الٹی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ لینس یہ بھی دکھاتا ہے کہ دونوں شمعوں کی لَو ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ الٹا دکھانا محدّب لینس کی خاصیت ہے۔

قارئین ”ماہنامہ قلندر شعور“ سے گزارش ہے

* محدّب عدسہ (Convex lens۔ درمیان سے ابھرے ہوئے اور کناروں سے پتلے لینس میں سے روشنی گزرتی ہے تو اندر کی طرف مڑتی ہے اور مرکزی نقطہ یعنی Focal Point پر آکر مرکوز ہوجاتی ہے۔)

کہ تجربے سے پہلے مشق کو غور سے پڑھئے اور تجربے کے بعد لکھئے کہ آپ کیا سمجھے؟

بھگت کبیر داس کہتے ہیں،

؎ رنگی کو کہیں نارنگی، تنت مال کو کھویا
چلتی کو کہیں گاڑی، دیکھ کبیر آ رویا

رنگ کو نارنگ یعنی رنگ نہیں ہے، کہتے ہیں۔ جوہر کو کھویا کہہ دیتے ہیں۔

چلنے والی شے کا نام گاڑی* رکھا ہے۔

نادانوں کی اس حالتِ زار پر فقیر روتا ہے۔

نفسِ مضمون کو مزید مثالوں سے سمجھئے۔

شیشے کے گلوب کے اوپر یعنی بیرونی سطح پر تصویر بنا دیں۔ جب روشنی گلوب کی سطح پر پڑتی ہے تو درخت کی تصویر گلوب کی نچلی سطح پر الٹی (Upside Down) نظر آتی ہے۔

شے کو دو زاویوں میں دیکھنے کی ایک اور مثال پنسل یا لکڑی کا پانی میں داخل ہونا ہے۔ شعاع لطیف سے کثیف میڈیم* میں داخل ہوتی ہے تو ایک مقام سے گریز کر کے مخصوص زاویے پر ترچھی ہو جاتی ہے۔ یہاں سے دوسرا مقام شروع ہوتا ہے۔ پنسل کو پانی سے بھرے شیشے کے گلاس میں ڈالئے۔ پنسل پانی میں ترچھی نظر آتی ہے۔ غور کیجئے، جس مقام سے ترچھی ہوئی ہے، وہاں میڈیم تبدیل ہوا ہے۔ اسی طرح جب شعاع آئینے میں داخل ہوتی ہے تو ترچھی ہو جاتی ہے۔ آئینے کے پیچھے چمکدار مواد سے ٹکرا کر واپس آتی ہے تو دوبارہ ترچھی ہو جاتی ہے۔ اس عمل سے آئینے کے اندر ٹرائی اینگل (مثلث) بنتا ہے۔ طرزِ فکر راست نہ ہو تو ٹرائی اینگل صرف آئینے کے اندر نہیں بنتا، دماغ کی اسکرین پر بھی بنتا ہے جو آئینے کے قائم مقام ہے۔

تفکر کا نتیجہ کیا ہے، قارئین لکھ کر بھیجئے کہ آئینے نے کیا دکھایا اور ہم نے کیا دیکھا؟ کیا ہم نے آئینے کے "اندر میں" دیکھنے کو دیکھا یا وہ دیکھا جو دماغ کی اسکرین پر ظاہر ہوا؟

یہ محض دو سطریں نہیں ہیں۔

دو طرزِ فکر کا بیان ہے۔

تفکر شکریہ کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔

(ادارہ — ماہنامہ قلندر شعور)

دیکھنے کے دو زاویے ہیں۔ دیکھنے کا ایک زاویہ

* چلتی کو کہیں گاڑی (گاڑ یا گاڑنا رکنے کے معنی میں آتا ہے۔) * میڈیم (واسطہ)

الوژن (فریبِ نظر) ہے۔ اس میں جو کچھ ہم دیکھتے اور سنتے ہیں، وہ حقیقت کے برعکس ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

"اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کے لئے کہو تو وہ تمہاری بات نہیں سنتے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں حالاں کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔" (الاعراف: ۱۹۸)

"اور تم دیکھتے ہو پہاڑ اور گمان کرتے ہو کہ یہ جمے ہوئے ہیں، یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔" (النمل: ۸۸)

دیکھنے کا دوسرا زاویہ متوجہ کرتا ہے کہ حقیقت ایک ہوتی ہے، اس میں دو، تین یا زیادہ اینگل نہیں ہوتے۔ یہ فکشن سے پاک زاویہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

"دل نے جو دیکھا، جھوٹ نہیں دیکھا۔"

(النجم: ۱۱)

دل کا دیکھنا براہِ راست ہے۔ اس میں الوژن شامل نہیں ہوتا۔ یہ وہ دل نہیں ہے جو گوشت کا ٹکڑا ہے بلکہ یہ دل میں وہ مقام ہے جسے قرآن کریم میں "فواد" کہا گیا ہے۔

دیکھنے کی طرزیں ایک سے زیادہ ہیں۔ جب دیکھنے کی طرز میں وہ رنگ شامل ہوتے ہیں جن میں ثقل (دوری) ہے تو مظاہر یا تخلیقات فرضی حالت میں نظر آتے ہیں۔ رائج طرزوں میں اس کو پوزیٹو کا نام دیا گیا ہے۔ پوزیٹو کی اصل کو عرفِ عام میں نیگیٹو کہتے ہیں۔

ہر شے دو رخ یا دو یونٹ پر قائم ہے۔

ایک جسم اور دوسرا حرکت ہے۔

دو یونٹ اس طرح مرکب ہوتے ہیں کہ مادیت سے متاثر ذہن کو ایک وقت میں ایک یونٹ نظر آتا ہے، دوسرا نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اوجھل ہونے کا تعلق طرزِ فکر سے ہے — جو طرزِ فکر مغلوب ہوتی ہے، آنکھ اس سے منسلک رخ کو نہیں دیکھتی۔

دو یونٹ سے مرکب آدمی جب آئینے میں دیکھتا ہے تو تیسرا یونٹ "عکس" نظر آتا ہے۔ غور کیجئے کہ یہ تینوں یونٹ آئینے میں ایک نظر آتے ہیں۔ آئینے کے پیچھے لگے مسالے نے تین یونٹ یا ٹرائی اینگل کو ایک یونٹ کے طور پر پیش کیا جسے ہم نے اپنی شناخت تسلیم کر لیا۔ اسی کو ہم دیکھتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر آئینے کے بغیر خود کو دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

یہی صورت کائنات اور افرادِ کائنات کی ہے۔

ہم تخلیق کو ابتدائی طور پر تین اسپیس میں تقسیم کرتے ہیں پھر اس تقسیم کو اس طرح یکجا کرتے ہیں کہ شے ایک نظر آتی ہے لیکن تقسیم برقرار رہتی ہے۔ یہ ٹرائی اینگل کی وضاحت ہے جس کے تینوں کونے △ ملتے ہیں لیکن ہر یونٹ الگ نظر آتا ہے۔ آئینے کے پیچھے لگا ہوا مسالا شے کو یونٹوں میں تقسیم کرتا ہے جس سے اصل مخفی رہتی ہے اور ذہن زاویوں میں الجھ جاتا ہے۔

دوسری مشق کیجئے۔

دو آئینے ایک دوسرے کے مقابل رکھیں کہ 180 ڈگری کا زاویہ بنے۔ کوئی شے ان آئینوں کے سامنے رکھیں۔ عکس بنے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے دو آئینوں کے درمیان زاویہ کم ہوتا ہے، اسی مناسبت سے آئینے میں بننے والے عکس کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔

180 ڈگری پر ایک عکس بنتا ہے۔
120 ڈگری پر دو عکس بنتے ہیں۔
90 ڈگری پر تین عکس بنتے ہیں۔
60 ڈگری پر پانچ عکس بنتے ہیں۔
45 ڈگری پر سات عکس بنتے ہیں۔
30 ڈگری پر گیارہ عکس بنتے ہیں۔
360 ڈگری پر کوئی عکس نظر نہیں آتا۔
360 ڈگری سے مراد دائرہ یا سرکل ہے۔

قارئین! ایک آئینہ وہ ہے جو دیوار پر لگا ہوا ہے اور ایک ذہن کی اسکرین ہے۔ اگر ذہن الوژن سے متاثر ہے تو دیوار پر لگے آئینے اور ذہن، دونوں میں دیکھنے کا نتیجہ الوژن ہے۔

ہماری سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ ہم نے الوژن طرز فکر کو میڈیم بنالیا ہے اور خود کو اس کے تابع کر دیا ہے اس لئے ہمیں الٹی شے سیدھی اور سیدھی شے الٹی نظر آتی ہے جیسے قرآن کریم کے مطابق پہاڑ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں لیکن ہمیں جمے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہم نے دیکھنے کے لئے ذہن کو اس طرز فکر کے تابع نہیں کیا جو حقیقی ہے۔ اگر ذہن کا آئینہ اندر میں دیکھنے کو دیکھتا ہے تو دیکھنے کی یہ طرز فریب سے دور کر کے حقیقت روشن کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

"جو لوگ مجھ میں جدوجہد کرتے ہیں، میں ان کے لئے اپنی راہیں کھول دیتا ہوں۔"

(العنکبوت: ۶۹)

سرورق کی تشریح

بہت سے آرٹسٹ پینٹنگ کرتے ہوئے پیلیٹ* میں صرف مفرد رنگ (سفید، نیلا، سرخ، پیلا اور سیاہ) رکھتے ہیں۔ آسمان، زمین، مٹی، پتھر، پھول، آدمی، حیوانات الغرض ہر شے پینٹ کرنے کے لئے ان ہی رنگوں کو مختلف تناسب سے ملا کر استعمال کرتے ہیں۔ ایک تجربہ کار آرٹسٹ ان بنیادی رنگوں کو ملا کر سیکڑوں شیڈز اور ثانوی رنگ بناتا ہے اور شے کو کسی حد تک اس کے قدرتی رنگوں میں پینٹ کر سکتا ہے۔ ایک مثال رنگین پرنٹنگ ہے۔ سفید کاغذ پر زرد، نیلے، سرخ اور سیاہ (CMYK) رنگوں کے امتزاج سے ہر قسم کی رنگین تصویر پرنٹ کی جاسکتی ہے جو اصل رنگوں کی نقل ہوتی ہے۔ الگ سے سفید رنگ استعمال کرنے کی بجائے کاغذ کی سفیدی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ کورے سفید کاغذ پر پرنٹنگ یا سفید کینوس پر کوئی منظر پینٹ کرنے سے رنگ اور کینوس کی سفیدی پسِ پردہ چلی جاتی ہے۔ سفیدی جو base* ہے، اس پر دوسرے مختلف رنگ اس طرح غالب آجاتے ہیں کہ ہم صرف اوپری منظر کو دیکھتے ہیں اور سفید base کو ایک طرح سے غیر موجود جانتے ہیں۔

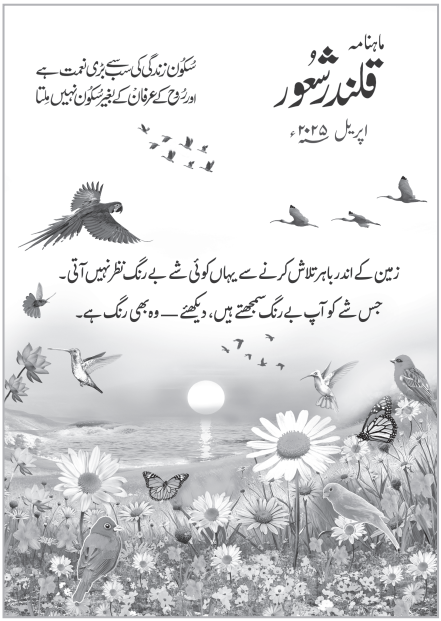

---

* پیلیٹ (رنگوں کی تختی۔ Palette) * Base (اساس)

سفید روشنی منشور (Prism) میں سے گزرتی ہے تو بنیادی رنگوں اور ان سے بننے والے ثانوی رنگوں میں تقسیم نظر آتی ہے۔ تمام رنگوں کی روشنیاں باہم مل کر سفید روشنی کس طرح بناتی ہیں؟

تحقیق و تلاش (سائنس) کی رُو سے انسانی آنکھ کے پچھلے حصے میں تین طرح کے بصری خلیے ہیں جو تین بنیادی رنگوں (نیلا، پیلا، سرخ) کا احساس رکھتے ہیں۔ سفید اور سیاہ کا احساس روشنی کی کمی بیشی سے ہوتا ہے۔ تین بنیادی رنگوں کی روشنیاں جب یکساں مقدار میں آنکھوں کے اندر داخل ہوتی ہیں تو تینوں قسم کے خلیات حسی اعتبار سے اپنی انتہا پر ہوتے ہیں اور اس وجہ سے تینوں رنگ الگ الگ نظر آنے کی بجائے سفید رنگ کے طور پر نظر آتے ہیں۔ گویا سائنسی اعتبار سے سفید رنگ کا نظر آنا خارجی عمل نہیں بلکہ آنکھ کے اندر خلیات کا یکساں طور پر متحرک* ہونا ہے۔

اس کے تقریباً برعکس ایک اور دلچسپ عمل کے بارے میں پڑھئے۔

کم از کم بنیادی رنگوں کے پینٹ (سفید، نیلا، پیلا، سرخ اور سیاہ) یا جتنے رنگوں کے پینٹ بازار میں دستیاب ہیں (کیوں کہ تمام رنگ دراصل بنیادی رنگوں پر مشتمل ہیں)، سب کو باہم ملایا جائے تو مٹیالا رنگ* حاصل ہوتا ہے۔ سفیدی، سیاہی اور دیگر رنگوں کے تناسب میں تھوڑی بہت تبدیلی سے مٹیالا رنگ ہلکا، گہرا یا کسی مخصوص رنگ کے شیڈ میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ یہاں محض روشنیوں کی بجائے مختلف رنگ مادی حالت میں موجود ہیں۔

محققین کا خیال ہے کہ کوئی مادی شے جس رنگ میں نظر آتی ہے، وہ اس کا رنگ نہیں ہوتا بلکہ وہ اس رنگ کے الٹ رنگ یا رنگوں میں ہو سکتا ہے۔ مثلاً محققین کا کہنا ہے کہ پیلے رنگ کا پھول پیلی روشنی کو منعکس کر دیتا ہے یعنی واپس کر دیتا ہے جب کہ باقی رنگوں کو جذب کرتا ہے لیکن مٹیالے یا مٹی کے رنگ کا معاملہ مختلف اور عجیب ہے۔ تمام رنگ ملانے سے اگر تمام رنگ منعکس ہوں تو سفید رنگ اور تمام جذب ہوں تو سیاہ رنگ بننا چاہئے پھر مٹیالا رنگ بننے کا کیا مطلب ہے؟ مطلب یہ ہے کہ تمام رنگ بیک وقت ایک خاص تناسب میں منعکس اور جذب ہوتے ہیں۔ سائنسی طور پر مٹی کا جو

---

* متحرک (stimulate) * مٹیالا رنگ (مٹی کا رنگ)

رنگ نظر آتا ہے، وہی اس کا حقیقی رنگ ہے اور یہ تمام رنگوں کا مرکب ہے۔

عظیم روحانی سائنس دان، خانوادہ سلسلۂ عظیمیہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ فرماتے ہیں:

"مٹی سے مراد روشنیوں کا وہ خلط ملط ہے جس میں تمام رنگ موجود ہیں۔ اسے 'کُل رنگ روشنی' بھی کہا جاتا ہے۔ اس طرح ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مٹیالا رنگ دراصل تمام رنگوں کا مجموعی تشخص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی بھی رنگ برنگ چیزیں ہمیں اس دنیا میں نظر آتی ہیں، مٹی سے نکلنے والے کسی نہ کسی رنگ پر مشتمل ہیں۔"

اپریل 2025ء کے "ماہنامہ قلندر شعور" کے سرورق پر مرشد کریم کے الفاظ،

"زمین کے اندر باہر تلاش کرنے سے یہاں کوئی شے بے رنگ نظر نہیں آتی۔ جس شے کو آپ بے رنگ سمجھتے ہیں، دیکھئے— وہ بھی رنگ ہے۔"

تخلیقی اسرار و رموز کا انکشاف اور اذہان کو تفکر کی ترغیب دیتے ہیں۔

آسمان میں سفید بادل ہیں، نیچے پانی ہے اور تصویر میں نیچے کی جانب زمین ہے۔ عموماً سفید رنگ کو کوئی رنگ نہیں سمجھا جاتا، پانی کو بے رنگ اور مٹی کے رنگ کو ایک طرح کی بے رنگی یا بے کیفی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ سفید رنگ تمام رنگوں کی روشنیوں کا مرکب ہے۔

دنیا کے مختلف خطوں، جوہڑوں، تالابوں، ندی، نالوں، نہروں، چشموں، دریاؤں اور سمندروں کا پانی کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم پانی کا ذکر کسی رنگ کے بغیر نہیں کر سکتے۔ آسمان، سورج، بادل اور فضا کی تمام رنگینیاں پانی میں موجود رنگوں سے منعکس ہو رہی ہیں۔ مٹی سے ہر رنگ کے پھول بُوٹے اور مخلوقات ظاہر ہوتی ہیں کیوں کہ مٹی تمام رنگوں کا خلط ملط ہے۔ ہر قسم کے ہلکے، گہرے اور شوخ رنگ کے پرندے، تتلیاں اور حشرات فضا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ یہ مٹی کے عناصر سے تخلیق ہوئے ہیں۔ ان عناصر کے مختلف تناسب (ratio) سے نباتات، جمادات، طیور، حیوانات اور ہر قسم کی تخلیقات ظاہر ہوئی ہیں۔ (تشریح: مکسل مینا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰسٓ شریف، قرآن کریم کا مکمل نسخہ اور ۳۰ سپاروں کا سیٹ

دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ساتھ اندرونی صفحات میں
خوب صورت ڈیزائن کردہ خط (font)
جس میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ آیات بآسانی پڑھی جا سکیں۔
زیادہ سے زیادہ لوگوں میں ایصالِ ثواب کے لئے تقسیم کیجئے۔

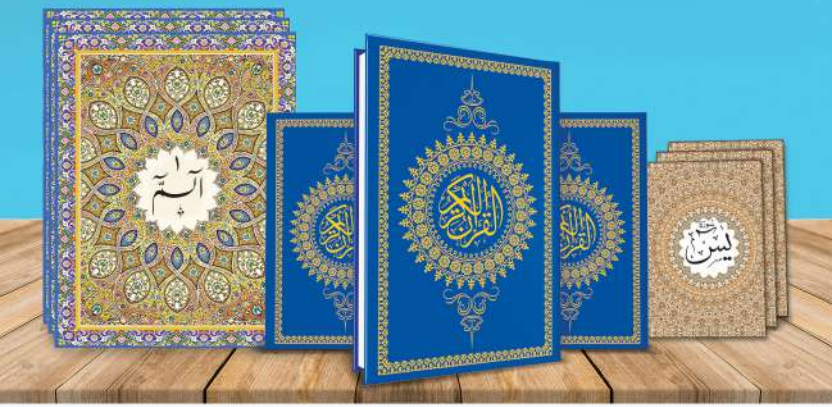

ملنے کا پتہ:
عظیمی محلّہ، سیکٹر 4-C، سرجانی ٹاؤن، کراچی، پاکستان۔

+92-(0)21-36417843
+92-(0)305-4435207

عظیمی
عظیمی یونیورسٹی پریس®
AZEEMI UNIVERSITY PRESS

زیرسرپرستی خانوادہ سلسلہ عظیمیہ

★ قلندر شعور اکیڈمی ★

مراقبہ ہال حیدرآباد

قلندر شعور ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ہم کائناتی تخلیقی فارمولوں کے تحت اپنے اندر روحانی صلاحیتوں کو متحرک کر سکتے ہیں۔

★ ★ ★

روحانی علوم کے متلاشی، راہِ سلوک کے مسافر اور روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے خواتین وحضرات کے لئے خوش خبری

گلشنِ شہباز، نزد ٹول پلازہ، جامشورو حیدرآباد، 71000، پاکستان
فون نمبر: 0331-3615533 ، 0333-2695331

تجمل
Tajammal

IATA
ACCREDITED AGENT
IATA Code: 27342433

تجمل ٹریولز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

تجمل للسفریات (الخاصہ) المحدودہ

ویزہ + ایئرلائن ٹکٹ

ہوٹل + زیارات ٹرانسپورٹ

بجٹ پیکج
اکانومی پیکج

5
ہوٹل کی بکنگ

ٹی ایچ اے اوورسیز ایمپلائمنٹ پروموٹرز

شبعۃ تی ایچ اے 〈THA〉 لتطور الامور تتعلق بالعمال/الموعطفین الاجانب

THA
OVERSEAS EMPLOYMENT PROMOTERS
Licence No. 4189/LHR
(خصۃ تسعۃ:۴۱۸۹/ایل ایچ آر

- Labour Visa
- Skilled Visa
- Un Skilled Visa

thaoep1@gmail.com

متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، قطر
ملائشیا، میں ملازمت کے شاندار مواقع

رانا تجمل حسین
CEO

+92 300 6654 211
+92 302 1165 300
+92 321 6680 266
+92 41 2641 904

Office No. 54, Gate No. 5, Iqbal Stadium. Faisalabad. PK

Canderel®

with Stevia

Naturally Sweet

Zero Calorie Sweetener

Available in Tablets, Sachets and Jars

SEARLE

عرفانہ شہزاد

اللہ کے دوست

"بچھو نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ آپ نے تین روز سے اسے قید کیا ہوا ہے اور وہ بھوکا پیاسا ہے۔ ابھی اسی وقت بچھو کو خانقاہ سے دور لے جا کر آزاد کریں اور اس سے معافی مانگیں۔"

کائناتی شعور غم و خوف سے آزاد کر دیتا ہے۔ یہ وہ شعور ہے جس میں نوعیں ایک دوسرے سے مانوس ہیں اور سب میں خیر کی مقداریں ہیں۔ اس کے برعکس انفرادی شعور میں خیر کے ساتھ شر کی مقداروں کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

جب آدمی درندے سے خوفزدہ ہوتا ہے تو خوف کی بنیاد پر درندہ غالب آجاتا ہے اور جب آدمی اپنی نوعی حیثیت* سے واقف ہوتا ہے اور واقفیت علم و عمل کے دائرے میں داخل ہوتی ہے تو درندہ تعظیم بجالاتا ہے۔

ابتدائی دنوں کا واقعہ ہے — خیال نے متنبہ کیا کہ آج کوئی انہونی پیش آسکتی ہے۔ فکر ہوئی کہ کیا کروں۔ خانقاہ کے سبزہ زار اور کیاریوں کا جائزہ لے کر تسلی کی کہ وہاں نوعِ حیوانات میں سے کوئی مخلوق چھپی ہوئی نہ ہو۔ بے چینی ہر لمحہ بڑھتی رہی لیکن اظہار نہیں کیا۔ دن چوکس سپاہی کی طرح گزارا۔

راہ نما شام کی سیر سے لوٹے تو دیکھا کہ ایک بھِڑ ان کی پیشانی پہ بیٹھنے کی کوشش میں ہے۔ ان کے ساتھ موجود بھائی نے اسے دور کیا۔ جاتے ہوئے بھِڑ نے میرے ہاتھ پر ڈنک مار دیا۔

راہ نما نے پوچھا، کیا تھا؟

عرض کیا، بھِڑ ہے۔

یہ فرماتے ہوئے آگے بڑھ گئے،

"سلام کرنے آئی ہوگی۔"

آدمی کے لئے موذی مخلوقات خیر کے پیکر انسان کے لئے خیر ہیں۔

* آدمی کی نوعی حیثیت "انسان" ہے۔ انسان احسنِ تقویم ہے۔ قارئین — بتایئے، احسنِ تقویم کیا ہے؟

ذہن نے کہا، تم نے محدود پیمانے میں اطلاع قبول کی جو درست نہیں ہے۔

قدرت کا نظام ہے کہ فرشتوں کے ساتھ ساتھ، اللہ کے نیک بندے جن کو اللہ نے دوست فرمایا ہے اور جو فی الارضِ خلیفہ کے منصب سے واقف ہیں، مخلوقات کو انسپائر کرتے ہیں۔

مرشد کریم فرماتے ہیں،

"اگر آپ کو کسی جانور سے ڈر لگتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کے اندر حیوانیت موجود ہے۔"

ذہن تلاش میں ہے کہ بِھڑ کی آمد کی اطلاع 12 گھنٹے قبل موصول ہونا کیا تھا؟

قارئین بہن بھائیوں سے سوال ہے کہ ہم اصل کی بجائے اطلاعات کے متضاد معانی کیوں قبول کرتے ہیں؟ یہ کون سی طرز فکر ہے؟

اُس وقت مجھے چینی قوم کا خیال آیا جس کے بارے میں ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسی محبّ الوطن قوم ہے کہ سب کا سب انسپائریشن قبول کر لیتی ہے۔

سیاق و سباق میں جائیں تو ابدالِ حق نے یہ بات اُس وقت فرمائی جب چین نوزائیدہ ملک تھا اور اُس کے پیشِ نظر ایک مقصد تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔ اس کے لئے وہ تندہی سے مصروفِ کار تھے۔ قدرت انسپائریشن پر عمل کرنے والوں کی معاون ہے۔

ایک نشست میں راہ نمائے فرمایا،

"درندے اور جانور میری بات سمجھتے ہیں، آدمی نہیں سمجھتے۔"

حاضرین کو سانپ سونگھ گیا۔ بات ایسی تھی کہ سب کے سر جھک گئے۔ یہ الفاظ آدمی کے اسفل سافلین میں ہونے کو بیان کرتے ہیں۔ نوعِ آدم جس کو اللہ نے احسنِ تقویم بنایا ہے، نافرمانی کے زون اسفل سافلین میں چلی جائے تو اس کی حیثیت سوالیہ نشان ہے۔

یہاں سے آدمی اور انسان میں فرق واضح ہوتا ہے۔ انسان کائنات کے تخلیقی فارمولوں کا امین ہے جب کہ آدمی کو تخلیقی فارمولوں کی خبر نہیں ہے۔ جتنی مخلوقات ہیں، کائناتی شعور میں زندگی گزارتی ہیں — اسفل سافلین کو قبول کرنے والا آدمی انفرادی سوچ کے تابع ہے۔

برسوں پہلے خانقاہ میں مور کا جوڑا آزادانہ

گھومتا تھا۔ ایک روز فجر کی نماز کے بعد راہ نما مسجد سے خانقاہ تشریف لائے تو مور حاضر ہوا، پر پھیلائے اور رقص کرنے لگا — رقص میں سرشاری تھی۔ انہوں نے مور کو مخاطب کیا،

"نہیں کرو، تم تھک گئے ہوگے، میں نے دیکھ لیا ہے۔"

مور نے فی الفور پر سمیٹے اور ہٹ گیا۔

بزرگ راہ نما نے فرمایا،

"یہ روز اسی وقت میرے پاس آتا ہے۔"

رقص نر مور کا خاصہ ہے۔ مادہ رقص نہیں کرتی۔ روحانی زبان میں بات کی جائے تو مور کا ہر پنکھ اور پنکھ میں ہر نقش ایک صلاحیت ہے۔ رقص محبت کی علامت ہے۔ جس سے محبت ہوتی ہے، مور اس کے سامنے تعظیم سے سرِ تسلیم خم کرکے رنگ رنگ پروں کو اس خوب صورتی سے پھیلاتا اور سمیٹتا ہے جیسے صفات سمیت خود کو سرنڈر کر رہا ہو۔

مور کا دل اللہ کے دوست کی محبت سے سرشار تھا۔ وہ ان کے آنے کا انتظار کرتا تھا۔

انہوں نے محبت قبول کی — اور فرمایا،

"نہیں کرو، تھک گئے ہوگے۔"

ہر نقش ایک صلاحیت ہے

اس قانون کو سمجھنے کے لئے خانوادہ سلسلۂ عظیمیہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ کی تصنیف "احسان وتصوف" میں "فرشتوں کی صلاحیتوں" کے عنوان سے تحریر پڑھئے۔ کتاب "احسان وتصوف" بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کے ایم اے اسلامیات کے نصاب کا حصہ ہے۔

پرندوں میں ایک جنس کوّا ہے۔ یہ تنہا کھانا نہیں کھاتا۔ کھانے سے قبل مخصوص آواز میں ساتھیوں کو شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ کوّا نہ صرف آدمیوں کے چہرے یاد رکھتا ہے بلکہ ساتھیوں کو بداخلاق لوگوں سے خبردار کرتا ہے۔ کوّا برادری کے کسی فرد کو آدمی سے تکلیف پہنچے تو مل کر بدلہ لیتے ہیں۔ اپنے ساتھی کی موت پر گریہ وزاری کرتے ہیں۔

ہمارے ایک کسان بھائی 40 سال پہلے کا واقعہ سناتے ہیں کہ انہوں نے فصل خراب کرنے پر غلیل سے کوّے کا نشانہ لیا۔ آج بھی جب وہ اپنے گاؤں جاتے ہیں، چند کوّے انہیں دیکھ کر غصے کا اظہار کرتے ہیں اور سر پر چونچ

مارنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

چیونٹیوں کا بھائی چارا، خاندانی نظام اور منظم طریقے سے کام کرنا ضرب المثل ہے۔ جب چیونٹی خوراک تلاش کرتی ہے تو اکیلی کھاتی ہے نہ ساتھیوں سے چھپاتی ہے۔ وہ راستے میں ایک قسم کا کیمیائی مادہ خارج کرتی ہوئی جاتی ہے، اشارہ ملتے ہی باقی چیونٹیاں اس جگہ پہنچتی ہیں جہاں سے پہلی چیونٹی نے غذا حاصل کی۔

پرندے طائرمائی کا انگریزی نام Shoebill ہے۔ مشہور ہے کہ اس کی آدمی سے دوستی صدیوں پرانی ہے۔ آدمی اس کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پر توڑ کر تحفے میں پیش کرتا ہے۔

مرشد کریم نے واقعہ سنایا۔

"ایک گلہری میرے پاس آنا چاہتی تھی۔ اسے موقع نہیں ملتا تھا۔ کئی دن گزر گئے۔ ایک روز میرے کمرے کے باہر کوئی نہیں تھا— دروازہ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔۔۔ گلہری بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میرے پیر کا انگوٹھا منہ میں لیا— ہلکا سا دبا کر چھوڑ دیا اور چلی گئی۔"

صاحبِ طریقت جانتے تھے کہ ننھی گلہری کئی روز سے قدم بوسی کی منتظر ہے۔ انہوں نے اس کی خوشی کا خیال رکھا۔

محسوس ہوتا ہے کہ ہم آدمیوں سے زیادہ بصیرت جانوروں میں ہے جو اللہ کے دوستوں کو پہچانتے ہیں اور خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش رکھتے ہیں جیسے شہنشاہ ہفت اقلیم نانا تاج الدین ناگپوریؒ جنگل میں آرام فرما رہے تھے کہ انہوں نے ساتھ موجود لوگوں سے فرمایا، شیر آئے گا، جس کو شیر سے ڈر لگتا ہے، وہ چلا جائے۔ کچھ دیر بعد شیر خدمت میں حاضر ہوا، قدم بوسی کی اور لوٹ گیا۔

ریچھ خوں خوار درندہ ہے۔ نوچ کر کھاتا ہے لیکن مردار نہیں کھاتا۔ آدمی کچھ دیر سانس روک لے تو وہ اسے مردہ سمجھ کر چلا جاتا ہے۔ سدھایا ہوا ریچھ کرتب دکھاتا ہے اور رقص کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔

کئی سال پہلے کا ذکر ہے کہ لاہور کے جیلانی پارک میں پھولوں کی سالانہ نمائش کے موقع پر جشنِ بہاراں تھا۔ ان دنوں راہ نما لاہور میں

تھے۔ عقیدت مندوں نے پھولوں کی نمائش میں شرکت کی درخواست کی۔

انہوں نے شفقت فرمائی۔

ہم نمائش میں پہنچے۔ پھولوں کی روشوں کے قریب میدان میں دائرے کی شکل میں ہجوم تھا۔ معلوم ہوا کہ ریچھ کا تماشا ہو رہا ہے۔

راہ نما چلتے چلتے ہجوم کے قریب ٹھہر گئے۔

عجیب منظر دیکھا— درندہ ریچھ کرتب چھوڑ کر یک لخت پلٹا، اللہ کے دوست کی طرف آیا اور دو پیروں پر کھڑے ہو کر آداب بجالایا۔

راہ نما کی نگاہیں ریچھ پر تھیں اور ریچھ ہجوم سے بے نیاز راہ نما کی جانب متوجہ تھا — کبھی کرتب دکھاتا اور کبھی دیوانہ وار رقص کرتا۔

ریچھ کے مالک نے رسّی کھینچ کر سختی کرتے ہوئے دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی، وہ ٹس سے مس نہ ہوا — دیوانہ وار جھومتا رہا۔

لوگ ریچھ کو بھول کر راہ نما کو تکنے لگے۔

ریچھ دیوانہ وار جھوم رہا تھا۔ جب مداری نے غصے میں آکر اس پر ڈنڈے برسانا شروع کئے تو ہمدرد و شفیق راہ نما کو بہت ناگوار گزرا۔ اسے تنبیہہ کی اور وہاں سے ہٹ گئے۔

یہ دیکھ کر دل نے کہا،

"درندے نے آدمیوں کے ہجوم کو متوجہ کیا کہ— انسان کی طرف دیکھو۔"

راہ نما نے ایک صبح خانقاہ کے ایک کارکن کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ صاحب خوشی خوشی آئے، یہ سوچتے ہوئے کہ بلاوا آیا ہے، پھول پھلواری کے حوالے سے کام کی رپورٹ خدمت میں پیش کروں گا۔

راہ نما نے ناگواری سے پوچھا، کیا آپ نے بوتل میں بچھو قید کیا ہے —؟

ان صاحب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ بہت نادم ہوئے اور اقرار کیا کہ چند روز پہلے بچھو نے کاٹ لیا تھا۔ بچھو سے تریاق بنانے کا ارادہ تھا کہ آئندہ اگر کسی کو کاٹے تو تریاق کام آسکے۔

راہ نما جلال میں آگئے۔ فرمایا،

"آپ کو پتہ ہے کہ خانقاہ میں کسی بھی چیز کو قید کرنے کی ممانعت ہے۔ بچھو نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ آپ نے تین روز سے اسے قید کیا ہوا ہے اور وہ بھوکا پیاسا ہے۔ ابھی اسی وقت بچھو کو خانقاہ سے دور لے جا کر آزاد کریں اور اس سے معافی مانگیں۔"

وہ صاحب بتاتے ہیں کہ میں نے بچھو کو خانقاہ سے فاصلے پر لے جاکر آزاد کیا اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہوئے کہا، مجھے معاف کر دو، تمہیں بوتل میں قید کر کے بھول گیا تھا۔

لاہور میں قیام کی ایک اور یاد حافظے میں محفوظ ہے۔ ایک شام جگنو کبھی راہ نما کے کمرے کے دروازے پہ جگمگاتا اور کبھی کھڑکی کی طرف آجاتا۔ بے قرار تھا۔ استادِ محترم سے اس بات کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا،

"جگنو آنا چاہتا ہے — یہاں لے آؤ۔"

بھائی نے ہاتھ بڑھایا تو جگنو فوراً ہتھیلی پہ بیٹھ گیا۔ کمرے میں آکر ہتھیلی راہ نما کے سامنے کی اور عرض کیا، حضور! جگنو آ گیا ہے۔

فرمایا، اسے یہیں چھوڑ دو۔

وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے عرض کیا، لگتا ہے کہ جگنو باہر کیاریوں سے آیا ہے۔

فرمایا، نہیں — یہ بہت دور سے آیا ہے۔

حاضرین نے دیکھا،

جگنو نے ان کے گرد چند چکر لگائے

جستجو کرتے ہی کرتے کھو گیا
ان کو جب پایا تو خود گم ہو گیا
کیا خبر یارانِ رفتہ کی ملے
پھر نہ آیا اس گلی میں جو گیا
جب اٹھایا اس نے اپنی بزم سے
بخت جاگے پاؤں میرا سو گیا
مجھ کو ہے کھوئے ہوئے دل کی تلاش
اور وہ کہتے ہیں جانے دو گیا
خیر ہے کیوں اس قدر بیتاب ہیں
حضرتِ دل آپ کو کیا ہو گیا
وہ مری بالیں پہ آ کر پھر گئے
جاگ کر میرا مقدر سو گیا
آج پھر بیدمؔ کی حالت غیر ہے
مے کشو لینا ذرا دیکھو گیا
(کلام: بیدمؔ شاہ وارثی)

پھر ایک طرف بیٹھ گیا۔

سوچتی ہوں کہ نوعِ جگنو کی نمائندگی کرنے والے جگنو کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت بخشی اسی لئے اس نے "بہت دور" سے پُرنور بندے کی لہروں کو محسوس کیا اور سفر کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دل نے کہا،

"جگنو نے روشنی کا طواف کیا۔"

گلِ نسرین

ایثار کی اسپیس

”جس طرح اللہ کے لئے خرچ کرنے میں ایک کے بدلے میں دس ملتے ہیں، اسی طرح اگر اللہ کے دیئے ہوئے مال سے اللہ کے لئے خرچ نہ کیا جائے تو ایک کے بدلے دس کم ہوتے رہتے ہیں۔“

بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ رشتوں کی بقا کے لئے لین دین* ضروری ہے۔ لین دین کے الفاظ پر غور کیجئے، یہ کیا کہتے ہیں—؟

لین دین تجارت میں ہوتا ہے،

رشتوں میں نہیں۔

رشتے ایثار کا نام ہیں۔

ایثار نہ ہو تو رشتے کھو جاتے ہیں۔

اگر لین دین کو ”خیال رکھنے“ کے الفاظ سے بدل دیا جائے تو بہت سے ذہنی، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ لین دین میں مفاد زیرِ بحث آتا ہے، غیر حقیقی توقعات قائم ہوتی ہیں اور رنجشیں بن جاتی ہیں۔

خیال رکھنے سے مراد ایثار سے واقف، دینے والا ہاتھ ہے۔ اہمیت دینے والے کی ہوتی ہے، لینے والا ہاتھ احسان کے بوجھ میں رہتا ہے۔ جب لینے کی عادت ہو اور دینے کا خیال نہ رہے تو ناقدری اور ناشکری بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً کوئی شے ملنے میں تاخیر ہو جائے تو اچھائی یاد نہیں رہتی، زبان پر شکوہ آجاتا ہے۔

لین دین کی طرز فکر میں حقوق یاد رہتے ہیں، فرائض بھول کے خانے میں چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف خیال رکھنے کے عمل سے فرد کا روحانی تشخص قائم رہتا ہے، ذہن دینے والا بنتا ہے، لوگوں سے لینے والا نہیں۔

سلسلۂ عظیمیہ کے قواعد وضوابط میں ہے،

”ہر حال اور ہر قال میں اپنا روحانی تشخص برقرار رکھیں۔“

ایسا فرد معاشرتی ضرورت کے لئے سماجی میل جول رکھتا ہے کہ آدمی، آدمی کی دوا ہے لیکن

* لین دین (Give and Take)

اس کا ذہن اللہ کی طرف ہوتا ہے۔ یہ بات یقین بن جاتی ہے کہ وسائل کا خالق و مالک اللہ ہے۔

خیال رکھنے کی طرز فکر ایثار کی لہروں پر قائم ہے۔ نوعِ آدم کی حیثیت سے ایثار ہر شخص کے فرائض میں شامل ہے۔ اسے مخلوقات میں جتنا بڑا منصب عطا کیا گیا ہے، ذمہ داری بھی اسی مناسبت سے ہے۔ فرائض کی پاس داری کرنے والا شخص سب کے حقوق پورے کرتا ہے کیوں کہ اپنے فرائض پورے کرنا، دوسروں کے حقوق کی ادائیگی ہے۔

فرائض کا دوسرا نام خدمتِ خلق ہے۔ خدمت کرنے والا، جس شخص کی مراد اس نے پوری کی ہے، خدمت کے ثمر سے پہلے فیض پاتا ہے۔ بشرطیکہ خدمت میں نمود و نمائش نہ ہو بلکہ اللہ کی رضا کے لئے ہو۔ خدمت سے اندر میں داخل ہونے والے سکون کی کوئی قیمت نہیں۔

سکون کیا ہے—؟ اللہ کا قرب ہے۔ ہم اسے اطمینان کی صورت میں محسوس کرتے ہیں۔

"یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔ خبردار! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔" (الرعد: ۲۸)

سکون کی کیفیت پر توجہ دیجئے اور دیکھئے کہ اس دوران میں اندر باہر کیا تبدیلی ظاہر ہوتی ہے— بے سکونی دور ہو جائے گی۔

ہر بات، کام، عمل اور حرکت بیج ہے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ مہینوں میں تیار ہونے والی فصل کے لئے خراب بیج کاشت کرے۔ اسی طرح اگر خدمت کے پسِ پردہ خود غرضی ہے تو یہ خدمت نہیں، تجارت ہے اور تجارت میں نفع کے ساتھ نقصان کے خدشات خوف میں مبتلا رکھتے ہیں۔ صرف اللہ کی رضا کے لئے کئے گئے عمل میں خوف و غم سے آزادی ہے۔

لین دین کی نوعیت عارضی ہے۔ تجارت میں ایک فریق کی وجہ سے نقصان ہو تو دوسرا فریق الگ ہو جاتا ہے اور نئے امکانات دیکھتا ہے۔ رشتوں میں ایسا نہیں ہے۔ رشتے اگرچہ عارضی ہوتے ہیں لیکن عارضی نہیں ہوتے، معاشرے کی بقا اور اپنی نسل میں اچھی طرز فکر کے تسلسل کے لئے ان کا قائم رہنا ضروری ہے۔

ہم نے زمین پر اپنے منصب سے واقف

(فی الارضِ خلیفہ) خواتین و حضرات کے بارے میں پڑھا ہے، ان کے شب و روز کو دیکھا ہے کہ ان کی ذات سرتا پا ایثار ہے۔

حاملِ علمِ لدنّی، خدمت و ایثار کے پیکر حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحبؒ کا 90ء کی دہائی میں ''روحانی ڈاک'' کے عنوان سے جنگ اخبار میں کالم شائع ہوتا تھا۔ اس کالم سے لاکھوں لوگ فیض یاب ہوئے۔ خطوط کے ریکارڈ سے منکشف ہوتا ہے کہ تعداد 20 لاکھ سے زیادہ تھی۔ اس کالم کے علاوہ ان کی خدمتِ خلق کا سلسلہ کتنا وسیع ہے، دنیا جانتی ہے۔

برسوں پہلے ''روحانی ڈاک'' میں خط شائع ہوا جس میں ایک صاحب نے لکھا کہ ہمارا خاندانی پیشہ تجارت ہے۔ ہم صاحبِ حیثیت لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں، ناجائز ذرائع سے گریز کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا ہوا کہ کاروبار پر زوال آنے لگا۔ سوچ سمجھ کر کئے گئے فیصلوں کے نتائج منفی رہے۔ ہم لاکھوں روپے کے مقروض ہو گئے ہیں۔

محترم عظیمی صاحبؒ نے جواب میں لکھا،

''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے پر فضل فرماتا ہے تو اس کے اوپر اللہ کی مخلوق کے حقوق بھی عائد ہوتے ہیں۔ خط کا بغور تجزیہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ سے حقوق العباد پورا کرنے میں بہت زیادہ کوتاہیاں واقع ہوئی ہیں۔ دس دنیا ستر آخرت والی بات تو آپ نے سنی ہوگی۔ جس طرح اللہ کے لئے خرچ کرنے میں ایک کے بدلے میں دس ملتے ہیں اسی طرح اگر اللہ کے دیئے ہوئے مال سے اللہ کے لئے خرچ نہ کیا جائے تو ایک کے بدلے دس کم ہوتے رہتے ہیں۔ یہی صورت آپ حضرات کے ساتھ بھی پیش آئی ہے اور پیش آرہی ہے۔

نفسیاتی طور پر اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ آپ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ اللہ کی مخلوق کے لئے ایثار کی طرز بھی اپنائیں۔ فی الوقت ایثار کے معاملے میں شعور کے اندر جو جمود پیدا ہو گیا ہے، اس کو ختم کرنے کے لئے ایسی طرزوں میں ایثار پیدا کرنا چاہئے جہاں بدل اور نفع کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔

اس کا طریقہ بہت آسان ہے۔ آپ اپنے قریب کوئی تالاب، ندی یا نہر تلاش کیجئے۔ ایسی ندی، ایسا تالاب یا نہر جس میں مچھلیاں ہوں۔ آپ جب یہ تلاش کر لیں تو پہلے سیاہ روشنائی ایک دوات میں بنا کر رکھ لیں۔ پتنگ کا باریک کاغذ تختوں کی شکل میں ایک دو چار تختے

لے لیں۔ اب قلم جو باریک ہو اور کاغذ پر خراش پیدا نہ کرے، فراہم کر کے صبح کی نماز کے بعد کسی سے گفتگو کئے بغیر قلم دوات اور کاغذ لے کر چھوٹے چھوٹے الف لکھنا شروع کر دیں۔ اس طرح کہ ہر الف کو قینچی سے الگ الگ کاٹ سکیں۔ الف کا لکھنا علمِ نفسیات کی روشنی میں شعور کے اوپر کیا اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ وضاحت طلب ہے جس کی اس کالم میں گنجائش نہیں ہے۔ ان کٹے ہوئے ٹکڑوں کو موڑ کر باریک باریک گولیاں بنالیں۔ گوندھا ہوا آٹا پہلے سے تیار رکھیں۔ کاغذ کی گولیاں آٹے کے اندر لپیٹتے جائیں۔ خشک ہونے پر ان سب کو ایک تھیلی میں بھرلیں اور جس پانی میں مچھلیاں ہوں، وہاں لے جا کر ڈال دیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر اپنے کاموں میں لگ جائیں — لیکن لکھنے، گولیاں بنانے اور گولیاں پانی میں ڈالنے کے دوران بات نہ کریں، سوائے کسی شدید ضرورت کے۔ یہ عمل آپ کے خاندان میں کوئی بھی کر سکتا ہے۔ زیادہ بہتر ہے کہ اس عمل کو تین مہینے جاری رکھیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تین ماہ کے اندر حالات رُو بہ ترقی ہوں گے۔ اس کا انحصار شعور کے اندر ایثار کے خلاف گرہ کھلنے پر ہے۔ یہ چند روز میں بھی کھل سکتی ہے البتہ تین مہینے میں لازمی طور پر شعور بحال ہو جائے گا۔"

جوابی خط میں یقین ہے — یہ ایثار کی لہروں سے لکھا گیا ہے۔ اس کا ہر جملہ حقوق و فرائض کے ضمن میں جمود کو توڑ کر ایثار کی طرز فکر کو بیدار کرتا ہے۔ خط کے جواب کو جتنی مرتبہ پڑھا جائے اور پڑھ کر تفکر کیا جائے — شعور کی گرہ کھلتی ہے، لاشعور سے مفہوم وارد ہوتے ہیں اور نفع و نقصان سے بالا سوچ معاشرے* کے لئے راحت بن جاتی ہے۔

جمود کو توڑنے والی ہدایات میں،

وقت کا ایثار ہے۔

پیسوں کا ایثار ہے۔

وسائل کا ایثار ہے۔

تقاضوں کا ایثار ہے۔

اس میں ہر اس سوچ کی نفی ہے جو خدمت اور ایثار کے خلاف ہے۔

ہم سب سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ کسی کام کو کرنے سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا۔ اس فائدے کا تقاضا عموماً مادی طرزوں میں ہوتا ہے کہ ہر لحاظ

---

* معاشرہ (معاشرے میں وہ فرد بھی شامل ہے جو لوگوں کے لئے راحت کا ذریعہ بنتا ہے۔)

سے مجھے کیا ملے گا۔ اس طرف توجہ نہیں جاتی کہ جس کام میں ہمارا دل ہے اور جس سے حاصل نفع و نقصان کی وجہ سے ہم حقوق العباد سے غافل ہیں، وہ طرز ٹوٹ رہی ہے، ہم اپنے لئے کمانے کا سوچتے تھے، اب پانی میں رہنے والی اللہ کی مخلوق مچھلیوں کے لئے غذا کا انتظام کررہے ہیں اور ایک بات جو بہت اہم ہے، وہ یہ کہ ہمیں نہیں معلوم وہ مچھلیاں کون ہیں، آٹے کی گولیاں جن کی غذا بنیں گی۔

اس عمل سے لاشعوری طور پر یہ طرز بیدار ہوتی ہے کہ جس کی مدد ہم کررہے ہیں، ذہن اس سے ہٹ کر یعنی نفع و نقصان سے ہٹ کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔

عموماً کسی کی مدد کرنے سے کہیں نہ کہیں اپنی مدح اور صلہ کا تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایثار کے خلاف ہے — ایثار یہ ہے کہ آدمی اللہ کی محبت میں مخلوق کی خدمت کرے۔

ایثار کرنے والا ہاتھ خالی نہیں رہتا۔ ذخیرہ دینے والے کے پاس ہوتا ہے۔ دوسروں کے لئے چراغ جلانے والے کے راستے میں اندھیرا نہیں ہوتا۔ اس کا ظرف روشنی کی طرح وسیع ہو جاتا ہے۔ خدمت علم، راہ نمائی، محبت، مدد، پیسے، وقت یا جس صورت میں ہو، خدمت کرنے والا گمراہ نہیں ہوتا۔ کائنات معاون بن جاتی ہے، کسی نہ کسی ذریعے سے جس کو ہم غیبی مدد کہتے ہیں، اس کے پاس وسائل آتے ہیں اور ان وسائل پر جس کا نام لکھا ہوتا ہے، اس تک پہنچ جاتے ہیں۔ مثبت طرزِ فکر کی وجہ سے وہ زندگی کے حقیقی سرچشمے سے جڑ کر مستقل چارج ہوتا ہے۔ کائناتی شعور کی توانائی اندر میں فیڈ ہوتی ہے۔ کائنات ایثار پر قائم ہے، اس کی توانائی ایثار کی فریکوئنسی پر مشتمل ہے — نفع و نقصان سے بالا خدمت کرنے والا بندہ ایثار کی اسپیس میں داخل ہو جاتا ہے۔

> نوجوان نے بزرگ سے کہا، وہ علم سیکھنا چاہتا ہوں جو آپ کے پاس ہے۔ کیا کروں؟
> بزرگ نے فرمایا، ایثار کرو، ہر شے کا ایثار کرو۔
> نوجوان نے پوچھا، علم کا ایثار سے کیا تعلق؟
> بزرگ نے فرمایا، ذہن کو ذہن سے ملانے کے لئے ایثار ضروری ہے۔ ایثار اندر میں شور کو دور کرکے ذہن کی زمین کو ہموار کرتا ہے۔

Manufacturer of
Embroided Lace & Fabrics

PRIME LACE INDUSTRIES
(PVT.) LTD.

C-8, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880107 Fax: 022-3880381

الوداع ــــ الفراق

فارسی ادب میں ''مثنوی مولوی معنوی'' کا منفرد مقام ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف چھ دفاتر پر مشتمل ہے جن میں اشعار کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مثنوی کی تصنیف کا سبب مولانا رومؒ کے مرید حسام الدین چلپی بنے۔ مولانا رومؒ نے دفترِ اول کے علاوہ ہر دفتر میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی دلچسپ پیرائے میں ظاہر و باطن کا احوال ہے جس سے ہر شخص فہم و فراست کے مطابق حکمت حاصل کرتا ہے۔ یہ مثنوی سادگی، روانی، منقولات و معقولات، نصیحت آمیز جملوں، تلمیحات و استعارات اور دلچسپ واقعات و تمثیلات کی وجہ سے ہر دور میں مقبول رہی ہے۔ ''ماہنامہ قلندر شعور'' کے قارئین کے لئے مولانا رومؒ کی مثنوی کا اردو ترجمہ اختصار کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔

جب پنجرے میں قید پرند نے سنا کہ آزاد فضا میں اڑنے والی طوطی نے کیا کیا، اس نے اس کی نقل کی ــــ کپکپایا، گرا اور ــــ؟

سوداگر نے اس کو اس طرح پڑا ہوا دیکھا تو تڑپ گیا۔ پھر اس کو پنجرے سے باہر پھینکا۔ طوطی زمین پر گرنے کی بجائے بلند شاخ کی طرف اُڑ گئی۔ مردہ طوطی نے اس طرح اڑان بھری جیسے سورج مشرق سے دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر سوداگر حیران ہو گیا۔ اس نے پرندے کے راز دیکھے۔

منہ اوپر کی طرف کر کے بولا، اپنے حال کی خبر دے کہ یہ کیا ہوا۔ طوطی نے وہاں ایسا کیا کیا جو تو نے یہاں سیکھ لیا؟ تو نے اپنی تدابیر سے ہماری آنکھیں بند کر دیں۔ مکر کیا اور ہمیں جلا ڈالا۔ ہمیں جلا دیا اور خود کو روشن کر لیا۔

سوداگر کی طوطی نے جنگل کی طوطی سے اپنی نجات کے لئے راہ نمائی چاہی تھی تو جنگل کی طوطی نے خود کو مردہ ظاہر کر کے پیغام دیا کہ اس دنیا میں زبان کو خاموش کر*۔

طوطی نے کہا، اُس طوطی نے اپنے عمل سے

* اس دنیا کے حواس کو ترک کر کے یہاں سے بعد کی دنیا کے حواس میں داخل ہو۔

مجھے نصیحت کی کہ بول چال ترک کر دے کیوں کہ تیری آواز نے تجھے قید کرایا۔

جنگل کی طوطی نے اس نصیحت کے لئے اپنے آپ کو مردہ بنالیا اور پیغام دیا کہ اے خاص و عام کو اپنی باتوں سے مست کرنے والے پرند!

میری طرح مردہ بن جا کہ نجات پائے۔

دانہ بنے گا تو پرندے تجھے چُگ لیں گے۔

کلی بنے گا تو بچے تجھے نوچ لیں گے۔

دانے کو چھپا، جال بن جا۔

کلی کو چھپالے، محل کا سبزہ بن جا۔

جس نے اپنے حسن کو بڑھایا،

سیکڑوں آفتوں نے اُس کا رخ کیا۔ آنکھیں اور غصہ اور رشک اس پر اس طرح برس پڑیں گے جیسے مشک سے پانی۔ دشمن حسد سے اسے نقصان پہنچائیں گے۔ دوست بھی اس کا وقت ضائع کریں گے۔ جو موسمِ بہار کی کھیتی سے غافل* ہو، وہ اس وقت کی قیمت کیا جانے۔

اللہ کی پناہ میں آنا چاہئے۔

اللہ سے دوستی کرنی چاہئے۔

یہ وہ پناہ ہے جس کے ذریعے کائنات خادم بن جاتی ہے۔ اللہ کی پناہ میں آ، جس نے روحوں پر ہزاروں مہربانیاں فرمائی ہیں — اور پناہ بھی کیسی کہ پانی اور آگ تیرے سپاہی بن جائیں۔

کیا حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ پر دریا مہربان نہیں ہوا؟ کیا اُن کے دشمنوں پر اس نے قہر نہیں ڈھایا؟ کیا آگ حضرت ابراہیمؑ کے لئے قلعہ نہیں بنی؟ یہاں تک کہ اس نے نمرود کے دل سے دھواں اٹھادیا؟

طوطی نے سوداگر کو مخلصانہ دو ایک نصیحتیں کیں۔ اس کے بعد کہا، سلام ہے، الفراق*۔

الوداع* اے سوداگر! تو نے کرم کیا۔

مجھے قید اور تاریکی سے آزاد* کر دیا۔

الوداع! میں وطن کو جاتی ہوں۔

تو بھی میری طرح کسی دن آزاد ہو جائے۔

سوداگر نے طوطی سے کہا، فی امان اللہ، جا۔ تو نے مجھے نئی راہ دکھادی ہے۔

طوطی نے اپنے وطن کا رخ کیا۔ سختی کے

---

* بہار کی کھیتی سے غافل (دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اگر یہاں بیج نہ بوؤ گے تو آخرت میں نہ کاٹو گے۔)

* الفراق، الوداع (وقتِ رخصت کے کلمات) * آزاد (دنیاوی علائق کے پنجرے سے آزادی)

بعد خوشی سے دل خوش ہو گیا۔

طوطی کے جانے کے بعد سوداگر نے خود سے کہا، جو اس نے کہا، وہ میرے لئے نصیحت ہے۔ اس کا راستہ اختیار کروں گا، یہ راستہ واضح ہے۔ میری جان طوطی سے کیا کم ہے۔ ایسی جان چاہئے جو نیک قدم ہو۔

جسم، پنجرے کی طرح ہے۔ اندرونی اور بیرونی لوگوں کے مکر کی وجہ سے جان کے لئے کانٹا ہے۔ جسم جان کو کہتا ہے، میں تیرا ہم راز ہوں اور جان اس سے کہتی ہے— نہیں! میں تمہاری ساتھی ہوں۔

جسم اس سے کہتا ہے کہ کمال، فضل، احسان اور سخاوت میں تجھ جیسا کوئی نہیں ہے۔ جان اس سے کہتی ہے کہ اگر تو یہ صفات اختیار کر لے تو دونوں جہاں تیری ملکیت ہیں۔

جسم اس سے کہتا ہے کہ ہم سب کی جانیں تیرے جان کی طفیلی ہیں، یہ عیش اور خوشی کا وقت ہے۔ جان اس سے کہتی ہے، پینے پلانے اور دوستی کا وقت ہے۔

جسم جب لوگوں کو اپنا شیدائی دیکھتا ہے، تکبر کی وجہ سے آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ اس جیسے ہزاروں کو شیطان نے نہر کے پانی میں پھینک دیا ہے۔

دنیا کی مہربانی اور مکاری مزہ دار نوالہ ہے۔ اس کو نہ کھا کیوں کہ وہ آگ سے بھرا ہے۔ اس کی آگ ڈھکی ہوئی ہے اور ذائقہ ظاہر ہے۔ اس کا دھواں آخر میں ظاہر ہوتا ہے۔

تو یہ نہ کہہ، خوشامد کا میں کب خریدار ہوں؟ مجھے معلوم ہے، خوشامد کرنے والا لالچ کی وجہ سے کہہ رہا ہے۔ تیری تعریف کرنے والا، اگر کھلم کھلا برائی کرے، ان سوزشوں سے تیرا دل عرصے تک جلے گا۔ اگرچہ تو جانتا ہے کہ اس نے محروم رہنے کی وجہ سے تجھے برا کہا ہے کیوں کہ وہ لالچ جو اس کو تجھ سے تھا، نہ ملا۔ اس کے الفاظ کا اثر تجھ میں رہے گا۔ جب تو یہ سمجھتا ہے کہ تو نے اسے محروم کیا ہے تو اس کی باتیں تجھے متاثر کریں گی۔ تعریف میں (بھی) یہ حالت معیار ہے۔ برائی کی طرح تعریف کا اثر بھی عرصے تک باقی رہتا ہے۔

تعریف جان کے تکبر اور دھوکے کا سرمایہ بنتی ہے۔ چوں کہ میٹھی ہے— اچھی لگتی ہے۔ برائی چوں کہ کڑوی ہے، بری لگتی ہے۔ برائی

مسہل اور گولی کی طرح ہے جو تو کھاتا ہے۔ اس کی شورش اور تکلیف دیر تک تجھ میں رہتی ہے۔ اگر تو حلوا کھائے، اس کا ذائقہ تھوڑی دیر رہتا ہے۔ حلوے کا اثر بھی اس کے اثر کی طرح پائیدار نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حلوے کا ذائقہ منہ میں نہیں ٹھہرتا، چھپا رہتا ہے۔ اسی صورت سے اس کا اثر بھی عارضی ہے۔

ہر ایک ضد کو دوسری ضد سے پہچان لے۔ جب کڑوی دوا کا اثر دیرپا ہے تو شکر کا اثر بھی دیرپا ہے۔ اس کی تاثیر مخفی رہتی ہے لیکن چند دن بعد قابلِ نشتر پھوڑا پیدا کر دیتی ہے۔

اے خوش مزاج! اگر تو گولی اور مسہل پیے، گندے مواد سے تیرا باطن پاک ہو جائے۔

نفس تعریفوں سے فرعون بن گیا۔

منکسر مزاج، خاکسار بن جا، سرداری نہ چاہ۔

جب تک ہو سکے، خادم بن، بادشاہ نہ بن۔

گیند کی طرح چوٹ برداشت کرنے والا بن، بلّا نہ بن۔ جب تیری مہربانی اور حسن نہ رہے گا، دوستوں کے تجھ سے دل بھر جائیں گے۔ خوشامد کرنے والے تجھ سے بھاگیں گے۔ وہ لوگ جو تجھے دھوکا دیتے تھے، تجھے دیکھیں گے تو بھوت کہیں گے۔ دروازے پر دیکھ کر کہیں گے، مردہ قبر سے نکل آیا ہے۔ اس طرح تجھ سے دور بھاگیں گے۔

شیطان شر پھیلانے کی وجہ سے آدمی کی طرف آتا ہے، تیری جانب نہیں آتا کیوں کہ تو شیطان سے بدتر ہے۔ جب تک تو آدمی* تھا، شیطان تیرے پیچھے دوڑتا تھا۔ جب تو شیطنت میں پختہ کار ہو گیا، اے نالائق! شیطان تجھ سے بھاگتا ہے — جو تیرے دامن سے چمٹا ہوا تھا، وہ تجھ سے بھاگ گیا۔ (باقی آئندہ ماہ پڑھیے۔)

یہ بھی پڑھیے

محفلِ سماع تھی۔ مولانا رومیؒ یکسوئی سے عارفانہ کلام سن رہے تھے۔ لوگوں کا حال یہ تھا کہ کوئی فرش پر تڑپ رہا تھا اور کسی کا گریبان چاک تھا۔ ایک شخص کی بے خودی بڑھی، وہ مولانا کی طرف بڑھا۔ خادموں نے اسے پکڑ کر دور بٹھا دیا۔

مولانا رومیؒ نے ناگواری سے خادموں سے فرمایا، "جام اس نے پیا ہے اور مستی تم کر رہے ہو؟"

* آدمی (یہاں آدمی سے مراد نوعِ آدم کی فطرت ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا۔)

ڈاکٹر نعیم ظفر

دانائی کی طرز

باطن کے مشاہدے سے شے (ظاہر) کی جزئیات سامنے آتی ہیں۔ باطن میں دیکھنے والا فرد خیال میں معنی پہنانے کی بجائے، خیال کو اصل حالت میں دیکھتا ہے۔

زندگی کا تذکرہ ہوتا ہے تو کسی نہ کسی نوعیت کی حرکت زیرِ بحث آتی ہے۔ اگر موضوع آدمی کی زندگی ہو تو حرکات و سکنات میں آدمی کے افعال* شامل ہوتے ہیں۔ ہر فعل کی ابتدا وہم* سے ہوتی ہے جسے باطنی علوم میں ہم دانائی کے معنی میں جانتے ہیں۔ غیر جانبدار* ذہن واقف ہے کہ کائناتی نظام میں مقداروں کی ایکویشن توازن پر قائم ہے۔ ان میں عدم توازن سے نظام متاثر ہوتا ہے۔ دانائی کی طرزیں قبول کی جائیں تو پیغمبرانہ تعلیمات کے مطابق آدمی کے حالات خیر ہیں وگرنہ زندگی خسارہ ہے۔

آخری آسمانی کتاب قرآن کریم میں ہے،

”زمانے کی قسم۔ بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔“ (العصر: ۱۔۳)

ہمارے سامنے لاکھوں سالوں کے علوم اور ٹیکنالوجی کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ موجودہ علوم کا ارتقائی دورانیہ چند ہزار سال سے زیادہ نہیں ہے لیکن وہم سے ماخوذ دانائی کے کرشمے ہر دور میں نرالے ہیں۔ یہ نرالے رنگ تاریخ کے پنّوں میں دانشور، مفکر، محقق اور ذہین خواتین و حضرات کی کاوشوں میں بھی ملتے ہیں — لیکن ان کا تفکر اپنے دور کی طرزِ معاشرت، لسانیات، معیشت، عقائد اور علوم و ٹیکنالوجی میں طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتا رہا جس نے وہم یا

* افعال (فعل کی جمع۔ کام، عمل) * وہم (اطلاع کے نزول کا پہلا مرحلہ) * غیر جانبدار (نیوٹرل)

دانائی کی طرزوں سے دوری پیدا کی اور ساکنانِ ارض کو خطرے میں ڈال دیا۔ قانونِ قدرت حرکت میں آیا— کبھی خون آشام جنگیں ہوئیں، کبھی زمین لرزی، کبھی آتش فشاں اگلے، کبھی آتشیں فلکی اجرام کی بارش ہوئی اور کبھی خشکی اور پانی کی حد بندیاں ٹوٹیں۔ یہاں تک کہ دانائی کی طرز کے برعکس "ناقص دانائی" کے پُرپیچ اور مایوس وجود کو وقت کے پہیّے نے مٹا دیا۔ موئن جو دڑو، وادیِ انکا، آثارِ مایہ، پیٹرا کے آثارِ قدیمہ اس کی چند مثالیں ہیں۔

ماہرینِ فلکیات ایک طرف کہتے ہیں کہ کھربوں کی تعداد میں نظر آنے والے دور بینی ستاروں میں بے ترتیبی ہے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ ہمارے نظامِ شمسی میں تمام سیارے، سیارچے، چاند اور سورج اپنے اپنے مدار میں میٹر کے کھربویں حصے کے توازن کے ساتھ حرکت میں ہیں۔ یہ دو متضاد بیانات ہیں۔ اندر کے علوم کی روشنی میں قارئین کی رائے کا انتظار ہے۔ خالقِ کائنات اللہ فرماتے ہیں،

"اور ہم نے زمین کو پھیلایا، اس میں پہاڑ جمائے اور اس میں ہر ایک چیز اندازے سے اگائی۔" (الحجر:۱۹)

آیت میں اندازے کے لئے لفظ موزون آیا ہے جو توازن کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

مائیکل ٹیلگرانڈ کی تحقیق ان محققین کے لئے امید کی کرن بتائی جاتی ہے جن کے دیکھنے کے زاویے نے اشیا کو بے ترتیب اور غیر متوازن دکھایا۔ وہ بے ترتیبی میں ترتیب کے متلاشی اور عدم توازن میں توازن کی کڑیاں جوڑنے میں مگن تھے۔ ٹیلگرانڈ کو سال 2024ء میں ریاضی میں Abel Prize سے نوازا گیا۔ فرانسیسی قومی سائنسی تحقیقی ادارے سے وابستہ ٹیلگرانڈ کو یہ ایوارڈ علمِ امکان میں گزشتہ 40 سال کی تحقیق اور گراں قدر کاوشوں پر دیا گیا۔

فی زمانہ ہر آدمی کی زندگی کمپیوٹر ڈیٹا کے گرد گھومتی ہے۔ محققین کے نزدیک اس وقت سب سے بڑا چیلنج آدمی کے گمان سے زیادہ ڈیٹا کی موجودگی ہے جس میں سے مطلوبہ انفارمیشن نکالنا محال ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ آدمی کے دماغ کی انتہائی محدود بساط ہے۔ رائج علوم میں مشاہداتی ڈیٹا سے جب کوئی انفارمیشن اخذ نہیں ہوتی تو ماہرین ایسے ڈیٹا کو رد کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے ڈیٹا میں زمینی و آسمانی آفات، موسمیاتی

تغیر، کہکشانی نظام، بری و بحری آثارِ قدیمہ اور دیومالائی تصورات بھی شامل ہیں۔

ٹیلگرانڈ کی تحقیق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی روشنی میں اب کسی ڈیٹا کو ناکارہ نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اس کی منطق میں جیومیٹریائی خوب صورتی ہے جو کینوس کو مکمل کر دیتی ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آج کا محقق جب ٹیلگرانڈ کی تحقیق کو درج بالا علوم میں استعمال کرے گا جیسے نامعلوم موسمیاتی تغیر تو تحقیق میں مثبت پیش رفت ہوگی۔

علمِ حساب اور علمِ طبیعیات کا دورِ حاضر کی سائنس و ٹیکنالوجی میں اہم کردار ہے۔ علمِ حساب مقداروں پر معین ہے جس میں شے میں عناصر کی مقداروں کا الجبرائی تناسب ایک مساوات (equation) سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مساوات کا مطلب متعاملات* اور حاصلات کے مابین توازن (برابری) ہے۔ طلبہ اسے مساوات میں برابر یا = کے نشان سے جانتے ہیں۔

الہامی علوم سے دوری کے سبب محققین کے علم کی اساس مادیت میں گم رہی۔ انہوں نے بیسویں صدی میں ایسے خیالات پیش کرنے شروع کئے جن کو گزشتہ مساواتوں سے ظاہر کرنا ممکن نہ تھا۔ محسوس ہوا کہ اٹھارویں صدی کے نظریات ڈھیر ہو رہے ہیں، نئے خیالات نئی سائنس کی نشاندہی کر رہے تھے لیکن کیا محقق نے خیال کی اہمیت کو جانا؟ کیا قرائن در قرائن ہونے والے ارتقا کی ماہیت سے واقف ہونے کی کوشش کی؟ گو کہ توانائی کی اصطلاحات وسیع پیمانے پر زیرِ استعمال تھیں مگر توانائی کی ترسیل میں موج کے کردار کی طرف توجہ نہیں تھی۔

انیسویں صدی میں میکانیکی توانائی کا دور تھا۔ حسابی مساواتیں لکھی گئیں، پیچیدہ نظریات پیش کئے گئے — ٹیکنالوجی کو آگے بڑھانا دشوار ہو گیا جس کی دو بڑی وجوہات تھیں۔

① اتنی ضخامت کے میکانیکی ڈیٹا کو دماغ میں بیک وقت کیسے یاد رکھیں؟

② اِس کا تجزیہ کیسے کریں؟

ایسے میں اکثر محقق کہہ دیتے ہیں کہ مظہر کے مشاہدے میں غلطی ہے، ڈیٹا کی جانچ صحیح نہیں ہوئی یا مطلوبہ مسئلہ بے معنی ہے۔ نیوٹرل ذہن سے اس دعوے پر غور کریں تو علم ہوگا

* متعاملات (کیمیائی مادے جو آپس میں ردِّعمل کر کے نئی اشیا بناتے ہیں۔ ان کے نتیجے کو حاصلات کہتے ہیں۔)

کہ خامی آدمی کی ذہنی و دماغی بساط کی ہے۔ مظہر اس وقت بھی تھا جب آدمی تھا نہ اس کی بنائی ہوئی مشاہداتی ٹیکنالوجی اور نہ ٹیکنالوجی سے واقف ماہرین تھے— البتہ کُھلے ذہن سے تسلیم کرنا درست ہے کہ مشاہداتی طرزوں میں مسئلہ ہے اور رائج ٹیکنالوجی اس کا حل نکالنے سے قاصر ہے، اس کے لئے ہمیں دوسری فکر اختیار کرنا ہوگی۔

بیسویں صدی میں محققین نے مادے کے ٹکڑے کر دیے۔ ''ڈی این اے'' سے لے کر موبائل فون کی چِپ تک تمام مظاہر کی مادی بساط ذرّات نظر آنے لگی۔ رنگ رنگ ذرّات کی تعداد کھربوں سنکھوں سے نہ جانے کتنے گنا بڑھ گئی۔ گنتی نہ ہوسکی مگر آدمی کو ''خیال'' آتا ہے، وہ ''دوبارہ سے'' مادے کو ادھیڑتا ہے اور ذرّات کا لامتناہی طوفان چھا جاتا ہے۔

ذہنی استعداد بڑھانے کے لئے ڈیٹا کے حجم کو ابتدا میں کمپیوٹر سے حل کیا گیا۔ مشاہدات کے لئے توازنی مساواتیں وضع کی گئیں مگر 1960ء کے بعد ٹیکنالوجی کے سائز اور رفتار کے علاوہ کوئی جدت نظر نہیں آتی۔

سرچ انجن گوگل کے مطابق نوبیل انعام یافتہ آدمی کا ڈی این اے 92 فی صد سے زیادہ junk یا بے کار مادے پر مشتمل ہے یعنی محققین کا کہنا ہے کہ ذہین آدمی کا جسم 92 فی صد بے کار مادے پر مبنی ہے۔

سوئٹزرلینڈ کی لیبارٹری سرن میں موجود 27 کلو میٹر گول برقی مقناطیسی سرنگ میں ان عناصر کو کئی دفعہ توڑا گیا جو علمِ کیمیا کے کیمیائی چارٹ میں موجود ہیں۔ تاحال جو ریسرچ شائع کی گئی، اُس میں نتائج کی حسابی مساوات میں ترتیب نہیں ہے۔ انہیں لکھنے کے لئے جو عمومی طریقہ رائج ہے، اس میں متعاملات اور حاصلات کے درمیان عدم توازن ہے یا غیر حسابی مساواتوں سے لکھا جاتا ہے۔ اے آئی، مشین لرننگ اور دیگر کمپیوٹر تکنیک غیر حسابی مساواتوں پر مشتمل ہیں۔

محققین کے مسودات میں حسابی مساوات توازن یعنی = سے ظاہر کی جاتی ہیں۔ غیر حسابی مساوات عدم توازن یعنی $\neq$ ، $\leq$ ، $\geq$ سے ظاہر کی جاتی ہیں۔ ان علامات کا مطلب بالترتیب ہے،

- برابر نہیں ہے۔
- برابر یا بڑا ہو سکتا ہے۔
- برابر یا چھوٹا ہو سکتا ہے۔

قارئین فیصلہ کریں کہ عدم توازن کی تینوں علامات کس علم کی طرف اشارہ ہیں—؟

علمِ حساب یا امکانیات میں ریسرچ کرنے والے خواتین و حضرات بہتر بتاسکتے ہیں کہ ان کی تحقیق میں حسابی فارمولوں میں عدم توازن کا تناسب کس قدر ہے!

خیالات یا انسپائریشن کا سلسلہ جاری ہے مگر فی زمانہ ٹیکنالوجی کا رخ کمرشل ازم یا منافع کی طرف ہے۔ انسپائریشن سے اخذ کردہ بڑے پیمانے پر پھیلی ”کمرشل دانائی“ بے حسی اور عدم توازن کا شکار ہوگئی ہے۔ لوگ کرب میں ہیں۔ یہ کرب ماں زمین کو کہاں چین سے رہنے دیتا ہے! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے مگر یہ سودا ان کے لئے نفع بخش نہیں اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نورِ بصارت سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔“ (البقرۃ: ۱۶۔۱۷)

سرن (CERN) دنیا کی سب سے بڑی زیرِ زمین تجربہ گاہ ہے۔ یہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر واقع ہے۔ سطحِ زمین سے تقریباً 100 میٹر نیچے، دائرے کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے۔ دائرے کا محیط کم و بیش 27 کلومیٹر ہے۔

انسپائریشن کو قبول کرنے میں طرزِ فکر اہم ہے۔ مادے میں اسیر محققین ظاہر سے باطن جب کہ باطنی علوم کے ماہرین باطن سے ظاہر کو تلاش کرتے ہیں کیوں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات بتاتی ہیں کہ انسان کے اندر ایسی بصیرت یا روشنی موجود ہے جو ظاہر کے باطن کا مشاہدہ کرتی ہے۔ باطن کے مشاہدے سے شے (ظاہر) کی جزئیات سامنے آتی ہیں۔ ایسا فرد خیال میں معنی پہنانے کی بجائے، خیال کو اصل حالت میں دیکھتا ہے۔

باطن میں بہت سے جز ہیں جو آدمی یا مادی محقق کے زاویۂ نگاہ سے باہر ہیں۔ اس سے شے کی حقیقت مخفی رہ جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ طرزِ فکر اور طرزِ نظر بیدار کی جائے جس میں شے کی حیثیت ثانوی ہے۔

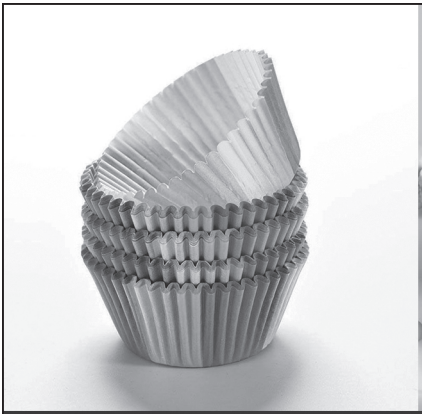

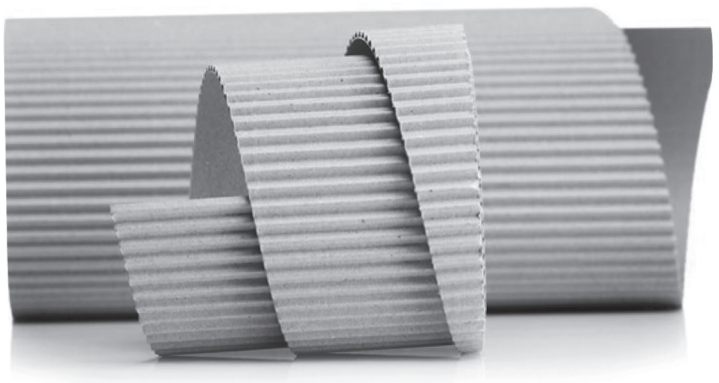

Manufacturer of
Liner & Floating Paper

PRIME PACK INDUSTRIES

C-21, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880627
Fax: 022-3880381

عابد محمود

صدقۂ جاریہ

حسان کو اماں کے بوئے ہوئے نیکی کے بیج کی حفاظت کرنی تھی۔ بیج کی حفاظت اس طرح ہوتی ہے کہ اس کا پھل اگلی نسلوں کو منتقل کیا جائے۔

اللہ کے دوستوں کو خوف و غم نہیں ہوتا۔

یہ الفاظ — منزل ہیں۔ سننے میں نرم، پڑھنے میں سہل مگر عمل کی دنیا میں ان لوگوں کے لئے سخت جن کا راستہ ''میں'' کے کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر کانٹا ''میں'' کا روپ ہے اور اس کی چبھن ''ہوں'' کا اعلان ہے۔ ''میں ہوں'' فرد کو خوف و غم کے خول میں بند کر کے یقین کو بے یقین کر دیتا ہے۔

خوف ''میں'' کی حفاظت کا نظام ہے۔

غم اس کمزوری کی تصویر ہے۔

خوف کس بات کا ہے؟ ناکام ہونے کا۔

جو میں چاہتا ہوں، اگر وہ نہیں ہوا۔

جو ہوا، وہ نہ ہوتا۔

یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا۔

یہ چھن نہ جائے، وہ کسی اور کو نہ مل جائے۔

ناکامی کا ہر روپ یقین سے دور، فریب ہے۔ خوف ناکام ہونے سے نہیں، اس کیفیت سے ہونا چاہئے جس میں ناکامی کو شکست سمجھ لیا جاتا ہے۔

خوف دیوار ہے جس کی دونوں طرف روشنی ہے لیکن خوفزدہ شخص کے حواس پر دیوار سوار ہے جو باہر نہیں، اندر ہے اور ''میں'' کی اینٹوں سے کھڑی کی گئی ہے۔ میں جو چاہتا ہوں، وہ ہو اور مجھے ہر جگہ قبولیت ملے — یہ نہ ہونے کا خیال خوف میں مبتلا کر دیتا ہے۔

رات تھی۔ صحن میں لگے بلبوں سے روشنی چھن کر گلی میں تاریکی کو مدہم کر رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے سے کسی گھر سے بچے یا بڑے کی آواز آتی اور سنسان گلی کو اپنے ہونے کی خبر دیتی۔

محلّے کے ایک گھر میں رہنے والا نوجوان جس کا نام حسان تھا، ملازمت کے لئے انٹرویو کی تیاری کر رہا تھا۔ گلی میں جتنی خاموشی تھی، اس کے اندر اس سے زیادہ شور تھا۔

- اگر میں سوال کا جواب نہ دے سکا؟
- وہ متاثر نہ ہوئے اور رد کر دیا؟
- کیا نوکری ملنے کے بعد دفتر میں اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھا سکوں گا؟

وسوسے عدم اعتماد میں اضافہ کر رہے تھے۔ حسان انٹرویو سے پہلے انٹرویو لینے والوں سے مرعوب ہو گیا تھا، شخصیت خوف اور وسوسوں کے سائے میں دب گئی تھی۔ گہرا سانس لے کر قلم میز پر رکھا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو اماں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

کیا بات ہے حسان، ایسے کیوں بیٹھے ہو؟ کھانا بھی نہیں کھایا؟ کب سے کمرے میں بند ہو۔ چہرے پر نرمی، لہجے میں فکر اور محبت تھی۔ ماں بیٹے کی پریشانی سے غافل نہیں تھی۔

حسان نے مایوس لہجے میں کہا، سیٹ ایک ہے، امیدوار بہت۔ اتنے لوگوں میں جگہ کہاں بنے گی۔ فکر ستا رہی ہے کہ انہوں نے مسترد کر دیا تو کیا ہو گا۔ کہاں کہاں دھکّے کھاؤں گا۔

ماں نے بیٹے کے بال سہلاتے ہوئے کہا، خوف بری چیز ہے۔ یہ روشنی کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ روشنی نہیں ہے، امید کے دیے بجھ گئے ہیں۔ نہیں! روشنی موجود ہے، یہ خوف ہے جو روشنی کو دیکھنے سے روک رہا ہے۔ تم وسوسوں میں مبتلا ہو کر وقت ضائع کر رہے ہو، یقین کی قوت سے کام کیوں نہیں لیتے۔ کس چیز کا خوف ہے؟ کل کیا ہو گا، میں نہیں جانتی لیکن تم نے انٹرویو سے پہلے خود کو اس ملازمت کے لئے رد کر دیا ہے۔

حسان نے چونک کر اماں کو دیکھا۔

کیا ایسا نہیں ہے؟ ماں نے پوچھا۔

اماں، میرے اندر احساسِ کمتری آ گیا ہے۔

اچھا ہے تم نے مسئلے کی جڑ پکڑ لی۔ تمہیں فکر ہے کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ کرسی سے مرعوب ہو اور سمجھ رہے ہو کہ تمہاری ملازمت کا فیصلہ وہ کریں گے۔ ذہن کو نتیجے سے آزاد رکھو۔ تیاری کر کے جاؤ، اعتماد کے ساتھ، یہ سوچ کر کہ اللہ نے چاہا تو ملازمت مل

جائے گی۔ اللہ نہ چاہے تو اس کا مطلب ہے کہ تمہاری ملازمت کا کھاتا دوسرے ادارے میں کھلے گا۔ بے خوف ہو جاؤ۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا؟ کسی اور کا انتخاب کر لیں گے، کرنے دو۔ کم از کم اس طرح تم خوف کے مرحلے سے گزر جاؤ گے۔ اور خوف کس بات کا، میں تو کہتی ہوں کہ لوگوں کی نظر سے خود کو دیکھنے کی بجائے اندر میں نظر سے خود کو دیکھو۔ یہ بات یاد رکھنا کہ ہم خود کو جس نظر سے دیکھتے ہیں، وہ احساس دوسروں کو منتقل ہوتا ہے۔

حسان کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا لیکن خوف کا اثر موجود تھا۔ اس نے کہا، اماں، خوف صلاحیتوں کو زنگ لگا دیتا ہے، غم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کل کے خوف نے ذہن مفلوج کر دیا تھا، آپ کی باتوں سے ہمت بندھی ہے۔ اب میں بے خوف ہو کر جاؤں گا۔

بیٹا، کل کیا ہو گا، یہ دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ تم کل کو دیکھو، اس کا سامنا کرو ورنہ کل وہی ہو گا جو ابھی ہو رہا ہے۔ خوف کی دیوار کو گرانے کے لئے اس میں سے گزرنا ہے، اس کا سامنا کرنا ہے۔ دیکھو گے کہ جتنی قوت تم نے خوف میں خرچ کی، وہ یقین میں خرچ کیوں نہیں ہو سکتی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

"یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہمارا رب ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے، ان کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔" (الاحقاف: ۱۳)

حسان نے کہا، شکریہ اماں! آپ سے بات کر کے خوف ہَوا ہو گیا۔ دعا کریں کہ کل میں ماحول کو خود پر طاری نہ کروں اور اعتماد سے ہر سوال کا جواب دوں۔

خوف کہاں ہَوا ہوا؟ تم نے پھر سے خوف کی بات کر دی۔ ابھی سے انٹرویو کے ماحول کو خود پر طاری کر لیا ہے۔ جب تک تم اپنے اندر اس منفی قوت کو جو تم نے مجتمع کی ہے، منتشر نہیں کرو گے، اثر رہے گا۔ پہلا قدم لینے سے پہلے اکثر خوف کا ایک درّہ آتا ہے، اس میں سے گزر گئے تو ساری عمر کے لئے حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا ہو جائے گی۔ جو کچھ میں نے کہا ہے، اس کو اپنا ماحول بنالو۔ خوف سے بے خوف اور غم سے بے غم ہو جاؤ گے۔

صبح اماں کی دعائیں لے کر گھر سے نکلا۔ ماں نے بیٹے کے چہرے پر اطمینان دیکھا تو خوش

ہو گئیں۔ ماں کی باتوں سے ملنے والا اعتماد خوف کی دیوار کو توڑنے کے لئے کافی تھا۔

انٹرویو ہال کے باہر بیٹھا تھا۔ کسی کو پریشان اور کسی کو بے فکر دیکھ کر رات کی کیفیت یاد آگئی۔ وسوسوں نے ایک بار پھر دستک دی۔ دروازہ کھولا تو چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ پھر وہی سوالات تھے کہ اگر میں اعتماد سے انٹرویو نہ دے سکا تو کیا ہو گا۔

اتنے میں اماں کی آواز آئی۔۔۔ ”کیا ہو گا؟ وہ کسی اور کو رکھ لیں گے اور تمہارا کھاتا کہیں اور کھل جائے گا۔“

حسان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

پاس بیٹھے نوجوان نے کہا، کبھی بے چینی سے پہلو بدلتے ہو، کبھی مسکراتے ہو۔ تمہارے اندر جنگ چل رہی ہے۔ کچھ دیر پہلے خوف جیت رہا تھا، اب اطمینان کا غلبہ ہے۔ دیکھتے ہیں کہ سامنے والا دروازہ کھولتے ہوئے کس کیفیت کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔

حسان نے چونک کر دروازے کو دیکھا۔

خوف کا دروازہ۔ یہی ہے خوف کا دروازہ۔

دروازہ نہیں، امتحان ہے۔

انٹرویو سے پہلے اس امتحان سے گزرنا ہے، اس احساس کے ساتھ جو اماں نے دیا ہے پھر انٹرویو کا خوف زیر ہو جائے گا۔ مجھے خوف کو رد کر کے بے خوفی کا تجربہ کرنا ہے۔

یہ کہتے ہی اندر میں حوصلہ پیدا ہوا۔

ساتھ بیٹھے نوجوان نے کہا، ٹھیک کہتے ہو کہ یہ خوف کا دروازہ ہے۔ ہم اسے پار کر لیں گے تو یہ ہمارا راستہ چھوڑ دے گا۔ یہ کہہ کر وہ قدم جما کر چلتا ہوا انٹرویو ہال کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا نام پکارا گیا تھا۔ جب وہ باہر آیا تو مطمئن تھا، قدموں کی مضبوطی قائم تھی۔ چہرے پر اندیشے نہیں تھے۔

اگلی باری حسان کی تھی۔ گہرا سانس لیا اور پُراعتماد قدموں سے انٹرویو ہال میں داخل ہوا۔

ہال اے سی کی وجہ سے ٹھنڈا تھا۔ خاموشی تھی۔ وہ لمحے جو کبھی حسان کے لئے پہاڑ تھے، بادل کی طرح گزر رہے تھے۔ ملازمت ملنے نہ ملنے کے خوف سے بے خوف ہو کر سوالوں کے جواب دیے۔ جہاں الجھن ہوئی، وہاں کھلے دل سے تسلیم کیا کہ میں اس کام سے واقف نہیں لیکن سیکھنے کے لئے تیار ہوں۔

جب وہ ہال سے باہر نکلا تو انٹرویو کا نہیں، خوف کا میدان فتح کیا تھا جیسے وہ اسی کام کے لئے یہاں آیا ہو۔ باہر نکلتے ہی ماں کو فون کیا۔ اماں! میں نے خوف کا دروازہ پار کر لیا ہے۔ اب جو اللہ کی رضا، وہ میری رضا۔

ماں کے الفاظ زادِ راہ بن گئے۔

"بیٹا! تم نے صرف خوف کو نہیں، غم کو بھی شکست دی ہے۔ جو چیز خوف میں مبتلا کرتی ہے، وہ غم پیدا کرتی ہے۔"

ملازمت کے لئے اُس نوجوان کا انتخاب ہوا جو حسان سے پہلے اندر گیا تھا لیکن اسے ملال نہیں تھا۔ اس نے قبول کیا کہ اللہ نے اس دفتر میں میرا کھاتا نہیں بنایا۔ جس کا رزق جہاں لکھا ہے، اسے وہاں پہنچنا ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے لیکن آدمی شک میں مبتلا ہو کر یقین کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے۔

دو ماہ بعد جس ادارے میں ملازمت ملی، وہاں سے (تقرری کا خط) اپائنٹمنٹ لیٹر لے کر گھر جاتے ہوئے حسان نے سوچا کہ قدرت ہماری تربیت کرتی ہے، صبر کرنا سکھاتی ہے، تجربات سے گزارتی ہے۔ تین چار اداروں سے گزر کر مجھے اس ادارے تک آنا تھا تاکہ کل کو جب میں فیصلہ سازی میں شامل ہوں تو اپنے تجربات یاد رکھتے ہوئے کسی کے ساتھ زیادتی نہ کروں۔

ملازمت کو آٹھ سال گزر گئے۔ عہدہ بڑھتا گیا۔ چہرے پر اطمینان اور انداز میں اماں جیسی نرمی در آئی تھی۔ دفتر میں نیا لڑکا آیا۔ قابل لیکن اپنی صلاحیتوں سے ناواقف، خاموش اور الجھا ہوا۔ وہ دفتر کے پرانے ملازمین سے مرعوب نظر آیا— آنکھوں میں کسی حد تک خوف تھا۔ وہی خوف جو کبھی حسان کے اندر تھا۔

لڑکے سے پوچھا، الجھے ہوئے کیوں ہو؟

لڑکا چونک گیا لیکن خاموش رہا۔

حسان نے نرمی سے کہا، میں بھی کبھی خوفزدہ تھا۔ خود کو نااہل سمجھتا تھا۔ کرسی کو دیکھ کر مرعوب ہو جاتا تھا لیکن اب نہیں ہوں۔ کوئی ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے، یہ اہم نہیں ہے، ہم خود اپنے بارے میں جو سوچتے ہیں، وہ اہم ہے۔ دیکھو! تم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن اپنے بارے میں جو کچھ خود سے کہا، میں

نے اسے محسوس کرلیا۔ لہریں بولتی ہیں۔ میں خوف اور مرعوبیت سے گزر گیا ہوں۔ اب ہنسی آتی ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں سے مرعوب تھا۔ اچھے لوگوں سے متاثر ہونا چاہئے لیکن عہدے اور وضع قطع کی وجہ سے کسی سے متاثر ہونا خامی ہے۔ سمجھو کہ ایک پردہ تھا فریب کا جو اتر گیا۔ میرے بھائی! یہاں کوئی تمہارے بارے میں نہیں سوچ رہا، سب اپنے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ کسی سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، دفتر میں پرانے لوگ تجربہ کار ضرور ہیں لیکن ذہانت کسی کی میراث نہیں۔

لڑکے نے شکر گزاری کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور اپنی میز کی طرف بڑھ گیا۔

حسان کو اماں کے بوئے ہوئے نیکی کے بیج کی حفاظت کرنی تھی۔ حفاظت اسی طرح ہوتی ہے کہ اس کا پھل اگلی نسلوں کو منتقل کیا جائے۔ عمل اچھا ہو، ایک سے دوسرے کو منتقل ہو اور سلسلہ قائم رہے تو صدقۂ جاریہ بن جاتا ہے۔

"میں" کا احساس اندر کے لئے اندھیرا ہے۔ یہ خوف پیدا کرتا ہے، خوف سے غم کے راستے کھلتے ہیں اور غمزدہ آدمی خود کو اللہ کی دوستی سے دور کرلیتا ہے۔ "میں" سے آزاد ہو کر آدمی اپنی خامیوں کو تسلیم کرتا ہے اور اصلاح کرتا ہے جس سے دل میں یقین کا نور غالب ہوتا ہے۔ یقین — رب کی رحمت ہے۔

اللہ نے فرمایا ہے،

"یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہمارا رب ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے، ان کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔" (الاحقاف: ۱۳)

اللہ پر یقین وہ منزل ہے جس پر "میں" جھک جاتی ہے۔ بندہ جان لیتا ہے کہ جو ملتا ہے، رب کی رضا سے ملتا ہے۔ وہ "میں" کے کانٹوں سے نکل کر خوف و غم سے آزاد ہو جاتا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا بیج

کوکوڈی مر (Coco de Mer) ناریل نما درخت Lodoicea maldivica کا بیج ہے۔ بحرِ ہند میں واقع جزائر پر مشتمل ملک سیشلز (Seychelles) میں پایا جاتا ہے۔ بیج کی طوالت 12 انچ اور وزن 18 سے 30 کلوگرام تک ہے۔ درخت کی اونچائی 102 فٹ تک ریکارڈ کی گئی ہے۔

کنہیالال کپور

مانگے کی کتابیں

کتابوں کی انتہا ہے نہ ان کا شمار۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشخاص کو بھی جن کے پاس کتابوں کے ذخائر ہیں، کچھ نہ کچھ کتابیں مانگ کر پڑھنی پڑتی ہیں۔ ایک اور طریقہ انہیں چرا کر پڑھنے کا بھی ہے لیکن چوری اچھی عادت نہیں، نیز پکڑے جانے کا بھی احتمال رہتا ہے اس لئے شرفا کتابیں مانگنے کو کتابیں چرانے پر ترجیح دیتے ہیں۔

مانگنا بذاتِ خود ایک ناخوش گوار فعل ہے۔ میں دعا مانگنے کے متعلق عرض نہیں کر رہا بلکہ کپڑے اور کتابیں مانگنے کا ذکر کر رہا ہوں۔

ایک شاعر نے کہا ہے،

"مانگنا ایک قسم کی اخلاقی موت ہے لیکن سائل کو انکار کرنا مانگنے سے بھی بدتر ہے۔"

کتابیں مانگنے والے اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں۔ کاش، وہ حضرات بھی اس سے اتنے باخبر ہوتے جن سے کتابیں مانگی جاتی ہیں۔

◆•◆•◆

ہمارے ایک دوست ہیں جن سے جب ہم کوئی کتاب مانگتے ہیں، ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں — انکار بھی نہیں کرتے لیکن کتاب مستعار دینے (ادھار) پر آمادہ بھی نظر نہیں آتے حتیٰ کہ ان کے دلائل سن کر ہم یہ شعر پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں،

؎ نہیں ہی کیوں نہیں کہتے زباں سے
نہیں کا کام کیوں لیتے ہو ہاں سے

بڑی نارضامندی کے ساتھ وہ کتاب ہمارے حوالے کرتے ہیں۔ اسے لے کر ہم ابھی مشکل سے گھر پہنچتے ہیں کہ ان کا خادم یہ دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوتا ہے کہ اگر ہم نے کتاب پڑھ لی ہو تو واپس کر دیں۔ بسا اوقات ہم کتاب کو پڑھے بغیر واپس بھجوا دیتے ہیں۔ ہمارے اس دوست کا عقیدہ ہے کہ اپنی گھڑی، اپنا قلم اور اپنی کتاب کسی شخص کو مستعار نہیں دینی چاہئے کیوں کہ اول تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا اور اگر کیا جائے گا تو اس کا حلیہ بگاڑ کر۔ یہ جب کسی کمزوری کے لمحے میں کتاب مستعار

دیتے ہیں تو ہدایت اور نصیحت کے ملے جلے انداز میں فرماتے ہیں،

"دیکھئے صاحب، یہ بڑی نایاب کتاب ہے۔ مرحوم دادا جان کو ایک انگریز نے تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔ خدا بخشے، دادا جان فرمایا کرتے تھے کہ کتاب موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔ اسے ذرا سنبھال کر رکھئے گا اور ہاں، پڑھتے وقت کسی صفحے پر روشنائی سے نشان یا دھبّہ مت لگایئے گا۔ بچوں سے اسے خاص طور پر بچا کر رکھئے گا۔ کہیں کوئی تصویر یا صفحہ اڑا نہ لے جائیں۔ دیکھئے، اس کتاب کی صرف دو جِلدیں دستیاب ہیں، ایک تو برٹش میوزیم لندن میں ہے اور دوسری خاکسار کے پاس۔"

لطف یہ کہ وہ ہر ایک کتاب کے بارے میں یہی کچھ کہتے ہیں حالاں کہ جن کتابوں کو نایاب قرار دیتے ہیں، بڑی آسانی سے کسی بھی کتب فروش سے مل سکتی ہیں۔ تاوقتیکہ انہیں کتاب واپس نہ مل جائے، چین نہیں آتا۔ جب کبھی ملاقات ہوتی ہے، احتیاطاً پوچھ لیتے ہیں،

"کتاب محفوظ ہے نا؟"

◆•◆•◆

ایک اور صاحب ہیں جنہیں ایک خاص تاریخ تک جس کا فیصلہ شروع میں کر لیا جاتا ہے، کتاب واپس نہ کی جائے تو طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ بھاگم بھاگ ہمارے ہاں آتے ہیں اور چھوٹتے ہی کہتے ہیں کہ دیکھو بھئی، آج پندرہ تاریخ ہے اور تم نے ہماری کتاب واپس نہیں کی۔

کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہم بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کی کتاب پڑھ کر کہاں رکھ دی تھی۔ اس وقت ان کا غیظ و غضب دیکھنے کی چیز ہوتا ہے۔ اتنے کوسنے دیتے ہیں کہ ہم کان کو ہاتھ لگاتے ہیں کہ آئندہ بڑی سے بڑی حماقت کریں گے لیکن ان سے کتاب نہیں مانگیں گے۔

وہ شکایت آمیز لہجے میں کہے چلے جاتے ہیں کہ ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ آپ یہ کتاب ضرور گم کر دیں گے۔ دراصل آپ ایسے غیر ذمہ دار اور لاپرواشخص کو کتاب مستعار دینا اس (کتاب) سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونے کے مترادف ہے۔ آپ نے ضرور وہ کتاب ردّی میں بیچ دی ہو گی۔ آپ پر تو مالِ مفت اور دلِ بے رحم والی مثل صادق آتی ہے۔ جب آپ مانگی ہوئی چیز کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتے تو آپ کو اسے مانگنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟

اِدھر ہم جھلّا کر کہتے ہیں کہ آپ خواہ مخواہ

پریشان ہو رہے ہیں، یہیں کہیں مل جائے گی۔

اُدھر وہ تلملا کر کہتے ہیں، بس اب مل چکی صاحب، اگر اسے ملنا ہوتا تو گم ہی کیوں ہوتی۔ ہمیں تو آپ کی بجائے اپنے پر غصہ آ رہا ہے، ہم نے وہ کتاب آپ کو دی ہی کیوں تھی؟

اتنے میں ہمیں ان کی کتاب مل جاتی ہے۔

اسے دیکھ کر ان کی جان میں جان آتی ہے۔

وہ ایک مرتبہ تسلی کرنے کے بعد کہ یہ وہی کتاب ہے، فرماتے ہیں کہ قسم ہے! اگر آئندہ آپ کو کبھی کتاب مستعار دی۔ اور ہم دل ہی دل میں عہد کرتے ہیں کہ لعنت ہے ہم پر اگر ہم نے آئندہ آپ سے کوئی کتاب مانگی۔

◆•◆•◆

ہمارے ایک اور دوست کسی گم نام کالج میں گم نام پروفیسر ہیں۔ یہ پچھلے بارہ برس سے کسی گم نام موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں چوں کہ ہر دوسرے سال ریسرچ کا موضوع بدل دیتے ہیں اس لئے ان کا thesis مکمل نہیں ہوتا۔

ان کے پاس لاتعداد پھٹی پرانی کتابیں ہیں جنہیں ہر وقت سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ پہلے خود کسی کتاب کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں پھر بتاتے ہیں کہ انہیں یہ کتاب کس پنساری سے کون سا سفوف خریدتے وقت دستیاب ہوئی تھی پھر اسے پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں لیکن جب ہم پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے ہیں تو لیت و لعل (ٹال مٹول) کرنے لگتے ہیں۔ آخر یہ طے پاتا ہے کہ ہم یہ کتاب صرف ایک دن کے لئے لے جا سکتے ہیں لیکن ہمیں اسے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن احتیاط کرنا ہو گی۔

ایک دفعہ شامتِ اعمال سے ان کی ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ کتاب ہم سے ضائع ہو گئی۔ دراصل ہمارے ملازم نے اسے نہایت فضول تصنیف سمجھتے ہوئے چولہے میں جھونک دیا بس پھر تو غضب ہو گیا۔ بہت سیخ پا ہوئے، دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے اور کہتے تھے، آپ نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں برباد ہو گیا۔ اس کتاب کی مدد سے مجھے "موئن جو دڑو کی تہذیب" پر thesis لکھنا تھا۔ اب میں عمر بھر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل نہیں کر سکتا۔ ہم نے گڑگڑا کر معافی مانگی اور بہت دیر تک کتاب کے یوں ضائع ہو جانے پر اظہارِ تاسف کرتے رہے لیکن ان کی کسی طرح تسلی نہ ہوئی۔ اب ان کا یہ معمول ہو گیا کہ

جہاں بھی ہوتے، جس حال میں ہوتے، اس بات کا چرچا کرتے کہ ان کے "ڈاکٹر" نہ بننے کی تمام تر ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے حالاں کہ ہم بخوبی جانتے تھے کہ ہمارے علاوہ اس المیے میں ان کی نااہلیت کا بھی کافی ہاتھ ہے لیکن مصلحتاً چپ رہتے۔

ایک دن جب ان کے ایک دوست کو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی تو وہ ازسرِنو ہمارے پاس شکایت کرنے آئے کہ اگر ہم سے ان کی وہ کتاب ضائع نہ ہوتی تو آج وہ بھی "پی ایچ ڈی" کہلاتے۔ شکوہ سن کر ہم اتنے خفیف ہوئے کہ تہیہ کرلیا چاہے ہمیں چار کھونٹ گھومنا پڑے، زمین و آسمان کے قلابے ملانے پڑیں، ہم ان کی کتاب ڈھونڈ نکالیں گے۔ بڑی بڑی لائبریریوں سے دریافت کیا— پرانے کتب فروشوں کو لکھا لیکن کہیں سے دستیاب نہ ہوئی۔

ایک دن جب ہم مایوس ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تو پان کھانے کے لئے ماتا دین پنواڑی کی دکان پر رکے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ماتا دین اُسی کتاب کے اوراق میں گاہکوں کو پان باندھ باندھ کر دے رہا ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس کے پاس اس کتاب کی پچاس جِلدیں ہیں جو ایک کباڑی سے آٹھ آنے فی سیر کے حساب سے خریدی ہیں۔

ہم نے فوراً ایک نسخہ موازی (برابر) تین آنے میں ماتا دین سے خریدا اور کتاب پروفیسر صاحب کے حوالے کی۔ حالاں کہ انہیں کتاب ملے چار سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن ابھی تک وہ پی ایچ ڈی نہیں ہو سکے۔

کتابیں مانگنے کے سلسلے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ کبھی اس شخص سے کتاب نہیں مانگنی چاہئے جو پرلے درجے کا خبطی ہو اور جس کو ہر وقت کتاب گم ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ پرانی اور بوسیدہ کتاب نہیں مانگنی چاہئے کیوں کہ اسے آپ کی بیوی یا نوکر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دے گا۔ وہ کتاب نہیں مانگنی چاہئے جس کا دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ ہو کیوں کہ اگر وہ گم ہو گئی تو کتاب کا مالک آپ کو حشر تک معاف نہیں کرے گا اور سب سے ضروری بات یہ کہ کتاب کبھی مانگنی ہی نہیں چاہئے، خرید کر پڑھنی چاہئے کہ اس طرح آپ کے علاوہ مصنفوں اور ناشروں کا بھی بھلا ہو گا۔

DEFENCE
3D - OPG - CEPH

3 DIMENSIONAL DENTAL IMAGING CBCT SYSTEM

KARACHI

3D

Free software provide with implant library to all consultant for Nerve Tracing. Cephalomatric Tracing, Implant Planing.

Maxillofacial

Implant Planning

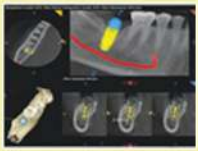

OPG

CEPH

Take Your Practice to the Next Level !

Defence branch:
0213-8941506 - 0343-7180348
Building # 7-C, Shop # 1, Street 10, Badar Commercial Area, Phase 5 Ext. DHA, Karachi.

Sharfabad branch:
0213-4920777 - 0320-4690899
Plot # 87, Shop # 2, Zulekha Tower, Block-3, BMCH Society, Main Jamal-ud-Din AfghaniRoad, Sharfabad, Karachi.

Email: info@3d-diagnostic.pk Web: www.3d-diagnostic.pk

عظیمی انسٹیٹیوٹ آف کلر تھراپی

سرپرست:

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی رحمۃ اللہ علیہ

حکومتِ پنجاب سے منظور شدہ

TEVTA NAVTCC PBTE NCT

کلر تھراپی ڈپلومہ کورس

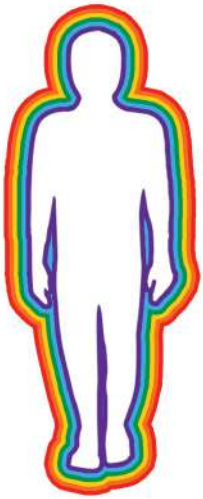

Career Opportunities

Graduates of this course can find employment opportunities in the following areas:

- Colour Therapy Clinics
- Alternative Medicine Departments
- Alternative Medicine Research Centers

WhatsApp
0334-6396370

Email
azeemi.colourtherapy@gmail.com

Website
www.azeemicolourtherapy.com

Head Office
204-B Tariq Gardens, Lahore

Sub Office
Azeemi Hospital, Kahna Nau, Lahore.

محمد عدنان خان

کورشِ اعظم

زمانیت کی بے رنگی سے طلوع ہونے والی مکانیت کے طول و عرض پر پھیلی ایک ایسے سرخیل رَزم و بزم طلسم کی داستان جس کے قدموں کی دھمک سے زمین لرزہ براندام تھی اور جس کے نام کا کوا کب میں شہرہ تھا۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ: قدیم سلطنت فارس کی ابتدا موجودہ ایران کے قدیم علاقے انشان سے ہوئی جس کا حکمران کمبائسس تھا۔ وہ مدائن (میڈیا) کے بادشاہ استغیز کا داماد تھا۔ کمبائسس اور شہزادی منڈانہ شادی کے کئی سال تک بے اولاد تھے۔ ایک شب منڈانہ نے خواب دیکھا جس کی تعبیر بادشاہ کے لئے پریشان کُن تھی۔ اس نے وزیر ہاراپاگس کی مدد سے بچے کو مارنے کا منصوبہ بنایا۔ شاہی چرواہے میتھرابیٹس اور اس کی طبیبہ بہن کو جبراً ذمہ داری سونپی گئی۔ قدرت کو بچے کی حفاظت منظور تھی۔ جس روز شہزادی کے ہاں ولادت ہوئی، اسی روز چرواہے کے گھر مردہ بچہ پیدا ہوا۔ طبیبہ نے بچہ تبدیل کر کے بھائی کو دے دیا۔ بچے کا نام کورش رکھا گیا۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تھا۔ ایک روز شاہی لڑکوں نے اس کی بکریوں کے ریوڑ پر حملہ کر دیا۔ اس نے انہیں مار بھگایا اور بعد میں گرفتاری دے دی۔ بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو استغیز اس کے نقوش دیکھ کر چونک گیا۔ کورش کی حقیقت معلوم ہونے پر بادشاہ کی نیند اڑ گئی۔ مارنے کی کوشش کی تو وہ زندان سے فرار ہو گیا۔ ملکہ اور منڈانہ کو حقیقت معلوم ہو گئی تھی۔ انشان واپس جاتے ہوئے ماں کو بچھڑا ہوا بیٹا مل گیا۔ وہ اسے انشان لے آئی۔ کورش اور مدائن کے بادشاہ استغیز کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا۔ اب آگے پڑھئے۔

کورش بیتان کے جنگی محاذ کی فتح کے لئے میز پر علامتی رَزم گاہ بنا کر گہری سوچ میں گم تھا۔ افرند نے متوجہ کرنے کے لئے کندھا تھپتھپایا۔ جواب میں کورش نے کہا، کساندانے کو بلاؤ۔ کساندانے دور نہیں تھی، حکم ملتے ہی خیمے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ کورش دونوں ہاتھ میز پر رکھے غور سے کچھ دیکھ رہا ہے۔ قریب گئی تو میز پر فرضی پہاڑ، ریت کے میدان اور کھائیوں کو دیکھ کر حقیقت کا گمان ہوا۔ دشمن کی چوکیوں کی ترتیب مہارت سے رکھی گئی تھی۔

کورش نے تمہید باندھے بغیر کساندانے کو دشمن، اپنی افواج اور میدانِ جنگ کی تفصیل فراہم کرتے ہوئے بیتان کو فتح کرنے کی حکمتِ عملی تیار کرنے کا حکم دیا اور افرند کے ہمراہ خیمے سے باہر آ گیا۔ کساندانے کی ذہانت سے پُر روشن آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اندازہ نہیں تھا کہ کورش اتنی بڑی ذمہ داری سونپے گا۔ یہ جنگی مہارت ثابت کرنے کا موقع تھا۔ وہ خوشی سے بیتان کی فتح کے منصوبے پر غور کرنے گئی۔

وہ جنگجو تھی۔ یہ صلاحیت اپنے دادا مارتھابیز سے منتقل ہوئی تھی جو اپنے وقت کا نامی گرامی منصوبہ ساز اور طاقتور جنگجو تھا۔

کورش سلطنت کے دیگر امور اور مسائل کے حل کے لئے مشیران کے ساتھ اجلاس میں شریک تھا۔ وہ ایسے افراد کو نظر میں رکھتا تھا جو سلطنت کے امور بہتر طریقے سے انجام دیں اور عدل و انصاف کی مثال بنیں۔ عدل پر قائم عظیم سلطنت کا قیام اس کا خواب تھا۔

مشاورتی نشست برخاست ہوئی تو افرند کے ہمراہ کھلے میدان کی طرف آیا۔ نگاہیں آسمان پر جمی ہوئی تھیں۔ شام نے سیاہ قبا اوڑھ لی تھی۔ رات کی تاریکی میں آسمان پر چمکتے ستاروں کی انجمن نے فضا پر سحر طاری کر دیا تھا۔

کورش نے کہا، افرند! روشنی ہے یا اندھیرا؟

افرند غیر متوقع سوال پر چونکتے ہوئے بولا، اندھیرے میں روشنی ہے۔

کورش بولا، یہ ظاہر بینی ہے۔ دیکھنے کے اس زاویے کو الٹ دو اور بتاؤ، کیا دیکھتے ہو؟

افرند کورش کے سوال پر حیران ہوا، حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ ارتکازِ توجہ سے حواس کے باطنی رخ کو غالب کرنے کی کوشش کی جس کی مشق کورش نے اسے کروائی تھی۔

کچھ دیر میں حیرت میں ڈوبی آواز سے بولا، اندھیرا — روشنی ہے۔ روشن آسمان پر بے شمار سیاہ نقطے ہیں۔

کورش گویا ہوا، ان میں الدِبران کو تلاش کرو۔

افرند علمِ جفر کے ساتھ نجوم سے بھی واقف تھا۔ کچھ وقفے کے بعد پُرجوش لہجے میں بولا، تلاش کر لیا۔

کورش نے پوچھا، مقام بتاؤ؟

آٹھ درجے برجِ جوزا پر ہے۔

الفول کو تلاش کر کے مقام بتاؤ؟

پچیس درجے برجِ ثور پر موجود ہے۔

پھر حکم ملا، الغراب اور مابوریاس کو تلاش کر کے ان کے مقامات بتاؤ۔

افرند آنکھیں بند کئے کسی معمول کی مانند تلاش میں تھا۔ آنکھیں کھولے بغیر کہا، الغراب 120 درجے برجِ میزان پر اور مابوریاس 12 درجے برجِ عقرب پر موجود ہے۔

کورش نے کہا، چاروں کو ایک مستوی* پر رکھنے کے لئے ان میں فرق کے اوسط* کا اندازہ کر کے بتاؤ کہ مربع* ظاہر ہوتا ہے، مستطیل* یا متوازی الاضلاع* بنتا نظر آتا ہے؟

افرند فکرمندی سے بولا، کورش! کچھ وقت درکار ہوگا۔ اور آنکھیں کھول دیں۔

کورش مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، دوست! تمہارا حساب کتاب کمزور کب سے ہوا؟

افرند نے جواب نہیں دیا مگر پوچھا، کہیں تم آسمانی راستوں کی تلاش میں تو نہیں ہو؟

کورش جو ایک مرتبہ پھر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا، گمبھیر آواز میں بولا، نہیں، تلاش اسے کیا جاتا ہے جو اوجھل ہو۔ میں تمہیں متوجہ کرنا چاہتا تھا کہ حساب کتاب میں استعداد بڑھاؤ۔ حساب نکال لو تو مربع، مستطیل یا متوازی الاضلاع میں سے جو بنے، ذہن میں رکھتے ہوئے اس کے آمنے سامنے کے کونوں کو ملا کر دو ترچھے خطوط کھینچنا۔ جس نقطہ پر خطوط ایک دوسرے کو قطع کریں، اسے مرکز بنا کر دائرے بنانا اور دیکھنا کہ Orion Belt پر موجود ستاروں النیتک، النیلام اور منتاکا میں سے کون سا ستارہ سب سے پہلے تمہارے بنائے ہوئے دائروں کو چھوتا ہے۔ دائرے اینٹی کلاک وائز بنانے ہیں۔

وہ خاموش ہوا تو افرند کی روشن آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ یقیناً کوئی مافوق الفطرت معاملہ ظاہر ہونے والا تھا۔ وہ کورش کی ذہانت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ اس کا علم جفر اور نجوم

---

* مستوی (Plane۔ ہر طرف پھیلی ہوئی سیدھی اور چپٹی سطح۔ مثال کے طور پر کاغذ کی سطح) * فرق کا اوسط (Average Deviation۔ ہر عدد اپنی اوسط مثلاً 3 سے کتنا دور ہے اور ان دوریوں کا اوسط کیا ہے۔)
* مربع (Square) * مستطیل (Rectangle) * متوازی الاضلاع (parallelogram۔ چوکور جس کے سامنے کی دونوں اطراف برابر اور سیدھی ہوں جیسے کتبے، ڈھلوان چھت۔)

سے بہت آگے اور مستند ہے۔ وہ اندر میں دنیا کا رہنے والا ہے۔ اشارہ سمجھ گیا کہ کورش چاہتا ہے کہ وہ اس علم سے رجوع کرے جس میں شک نہیں ہے اور جس میں ذہن کی رفتار نہایت تیز ہو جاتی ہے۔

ان کا رخ سرحدی چوکی کے نزدیک مرکزی خیمے کی جانب تھا جہاں کساندانے بیتان کے محاذِ جنگ کی فتح کے لئے منصوبہ ترتیب دے رہی تھی۔ وہ خیمے کے نزدیک پہنچے تھے کہ کچھ فاصلے پر موجود سرحدی چوکی کی طرف سے تلواروں کی زوردار کھنکھناہٹ کے ساتھ شور بلند ہوا۔

شور اتنا زیادہ تھا کہ جہاں کساندانے خیمے سے تلوار سونتتے ہوئی نکلی، وہاں کورش نے بھی تلوار نکالتے ہوئے افرند سے چیختے ہوئے کہا، اسے لے کر فوراً محل چلے جاؤ۔

کساندانے لڑنے کے لئے تیار تھی۔ کورش سے کہا، آپ کو اس طرح چھوڑ کر جانا بزدلی ہے، میں ساتھ دینا چاہتی ہوں۔

کورش گھوڑے کی زین کَستے ہوئے بولا، یہ حملہ مدائن کی جانب سے نہیں ہے۔ اس کے پیچھے بیل شازار کے لوگ ہیں جو تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ ان کے ہمراہ ماہر ساحر ہیں۔ تمہاری یہاں موجودگی کی تصدیق مدائن کے ساتھ بابل سے بھی جنگ کا محاذ کھول دے گی اس لئے فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ ہماری فکر مت کرو۔ ہمیں یقین ہے کہ اللہ ہم لوگوں کو ان پر غالب کرے گا۔ جاؤ افرند، وقت نہیں ہے، ساحروں کا اثر پھیل رہا ہے۔

افرند نے کورش کے چہرے پر اتنی تشویش پہلے نہیں دیکھی تھی۔ معاملے کی نزاکت سمجھتے ہوئے کساندانے کو لے کر گھوڑوں کی جانب دوڑ لگادی۔ چند لمحوں میں وہ اندھیرے کی چادر میں لپٹی ستاروں کی روشنی میں اوجھل ہوگئے۔

کورش شہادت کی انگلی سے فضا میں دائرہ بناتا اور ہتھیلی سے دائرے کو ان دونوں کی جانب بظاہر دھکیل دیتا۔ یہ عمل چند مرتبہ دہرا کر اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے — وہ اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست کر رہا تھا۔ رب سے نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ رجوع کرنا قابلِ دید تھا۔

تلواروں کے ٹکرانے کی آوازیں خاموش ہوگئی تھیں مگر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔ لگتا تھا، حملہ آوروں نے چوکی پر موجود انشان کے سپاہیوں پر غلبہ پالیا

تھا۔ یہ حیرت انگیز تھا کہ سخت تربیت یافتہ سپاہی اتنی آسانی سے مغلوب ہوگئے۔ وجہ سحر کا اثر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو سحر پھونکا گیا ہے، وہ طاقتور ہے۔ اس میں ماہر لوگ بیل شازار کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے تھے۔

586 ق۔م میں بابل کے بادشاہ نیبوکڈ نضر دوم (Nebuchadnezzar II) جس کو تاریخ بخت نصر کے نام سے جانتی ہے، نے یروشلم پر حملہ کرکے اسے تباہ کر دیا تھا اور مقامی لوگوں کو وہاں سے بے دخل کرکے بابل میں اسیر کرلیا تھا۔ کئی سالوں کے بعد جب اقتدار نیبونائیڈس کو منتقل ہوا تو بخت نصر کی لوٹی ہوئی اشیا اور قیدی اس کے قبضے میں آگئے۔

نیبونائیڈس کا اقتدار کمزور تھا۔ وہ کمزور بادشاہ تھا۔ وجہ اس کے عقائد تھے۔ بابل کی حکومت روایتی عقائد پر قائم تھی۔ لوگ اپنے اجداد کے بنائے ہوئے دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ نیبونائیڈس نے ایک اور دیوتا کی پوجا شروع کر دی تھی۔ یہ بات ان لوگوں کو سخت ناگوار گزری جن کا اثر و رسوخ حکومت میں زیادہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیبونائیڈس غیر مقبول ہوگیا۔ اس نے دباؤ سے بچنے کے لئے اپنے عیاش طبع بیٹے بیل شازار کو "شریک بادشاہ" قرار دے کر اقتدار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

بیل شازار ظالم و جابر ثابت ہوا۔ کساندانے کے والد کو قتل کروا کر اسے قیدی بنایا۔ جس روز سے وہ قید سے آزاد ہوئی تھی، بیل شازار کا سکون غارت تھا۔ اس نے قید خانے پر مامور لوگوں کو سخت سزائیں دیں اور تلاش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر ناکام رہا۔ تھک ہار کر سفلی علم کی مدد لی۔ اس علم میں سب سے ماہر شخص کو بلایا مگر ناکامی ہوئی۔ وہ اتنا بتا سکا کہ کساندانے کسی توحید پرست کی حفاظت میں ہے۔ تلاش میں ان لوگوں میں سے کچھ لوگ مددگار ہوسکتے ہیں جو بخت نصر کے عہد میں یہاں لائے گئے اور بابل کے اسیر تھے۔

بیل شازار نے ان کو طلب کرکے آزادی کا لالچ دیا اور دھمکایا۔ وہ اس کام میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے لیکن دھمکیوں سے گھبرا گئے۔ سب سے زیادہ تربیت یافتہ فوجی دستے کو ان کے ماتحت کیا اور جس طرح ممکن ہو، کساندانے کو واپس لانے کا حکم دیا۔

کورش کی بہادری، جواں مردی اور عدل و

انصاف کے چرچے جہاں میڈیا (مدائن) اور انشان میں زبان زدِعام تھے، وہاں بابل کے لوگ بھی دعا کرتے تھے کہ ان کا حکمران کورش جیسا ہو۔ اس کی شہرت بابل کے اسیروں تک بھی پہنچی تھی۔ وہ اسے اپنے لئے امید کی کرن سمجھتے تھے۔

کورش آندھی کی طرح میڈیا (مدائن) جیسی سلطنت کو نگل رہا تھا— سب جانتے تھے کہ حالات جس رخ پر آگے بڑھ رہے ہیں، وہ وقت دور نہیں کہ میڈیا یعنی مدائن پر کورش کا قبضہ ہو جائے۔

جب علمِ سحر میں ماہر مذکورہ لوگوں نے معلوم کرنے کی کوشش کی تو وہ یہ جان کر سراسیمہ رہ گئے کہ کساندانے کے نشان اس علاقے میں ہیں جو کورش کے زیرِتسلط ہے۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ کورش جہاں پہاڑ جیسا حوصلہ رکھنے والا اور ناقابلِ یقین حد تک طاقتور ہے، اس کی روحانی پرواز بھی بلند ہے۔ اس کی قوت کا سامنا کرنا ان کے بس سے باہر تھا مگر اس بات کا اظہار انہوں نے جان بوجھ کر نہیں کیا کہ بیل شازار کے مزید عتاب کا شکار نہ ہو جائیں۔

جب وہ کورش کے مقام کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے تو وہ انہیں کہیں دکھائی نہ دیتا یا بیک وقت کئی جگہوں پر اس کے نشانات ملتے۔ کورش کو چھوڑ کر کساندانے پر توجہ مرکوز کی تو معلوم ہوا کہ وہ بیتان کے نزدیک انشان کے سرحدی علاقے میں ہے۔ یہ جاننے کے لئے کہ کورش وہاں ہے یا نہیں، وہ انہیں دور دور تک نظر نہیں آیا۔ ساحروں نے بیل شازار کے دستے کو تیاری کا حکم دے کر سحر پڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے مصلحتاً علاقے کی نشاندہی نہیں کی بس دستے کو مشرق کی سمت حرکت کرنے کا کہا۔ انشان میں داخل ہونے کے لئے چالاکی سے ان راستوں کا انتخاب کیا جو دشوار گزار تھے، جہاں انشان کے فوجیوں سے ان کا سامنا ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ اپنے ہدف پر توجہ مرکوز کرکے اس تک پہنچنے اور خاموشی سے اغوا کرنے کا منصوبہ بنائے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہم و گمان میں نہ تھا کہ تھوڑی دیر میں کس سے سامنا ہونے والا ہے۔

(قسط: ۲۰)

اقتباسات

"ماہنامہ قلندر شعور" کو گُل دستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوشش قابلِ قدر ہے۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالے کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم و بیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو ۔

قرآن کریم میں مذکور حضرت اسماعیلؑ کا واقعہ ہمیں درسِ ہدایت دیتا ہے کہ اللہ کی خوشنودی کے لئے جب کوئی عمل کیا جاتا ہے تو اس کے نتائج رہتی دنیا تک قائم رہتے ہیں۔ بی بی ہاجرہؑ کا اللہ کی ذات پر توکل کر کے جنگل بیابان میں رہ جانا، پانی کی تلاش میں دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑنا اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند آیا کہ اللہ رب الرحیم نے بنجر زمین میں پانی کا چشمہ جاری کر دیا اور اس ایمان و ایقان کے عمل کو دہرانا ہر اُس فرد پر لازم کر دیا گیا جو اللہ کے مقدس گھر کی زیارت عمرہ و حج کے لئے حاضر ہو۔ اسی طرح حضرت اسماعیلؑ کا قربانی کے لئے آمادہ ہونا اس بات کا بے مثال ثبوت ہے کہ وہ مادی دنیا میں رہتے ہوئے مادیت سے ماوراعالمین سے واقف تھے۔ حضرت اسماعیلؑ خواب اور بیداری کے حواس سے مکمل واقفیت رکھتے تھے۔ (افضال صدیقی۔ راولپنڈی، کتاب: خاتم النبیین محمد رسول اللہؐ۔ جلد سوم)

تذکرہ نگاروں کے مطابق عالی دماغ البیرونی کے ہاتھ میں ہر وقت قلم ہوتا تھا۔ سال میں وہ صرف دو دن یعنی نوروز اور مہرجان کے دن تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول نہ ہوتا۔ کتابوں کے بارے میں البیرونی کا کہنا تھا کہ یہ میرے بچے ہیں۔ البیرونی نے 1018ء میں جہلم، پاکستان سے 42 میل دور ایک موضع دھریالہ جلوپ کے 1795 فٹ اونچے پہاڑ پر سے زمین کا قُطر اور محیط معلوم کر کے 24,779 میل نکالا جو موجودہ پیمائش سے 78 میل کم تھا۔

(اقرا چوہدری۔ جہلم، کتاب: مسلمانوں کے شاندار سائنسی کارنامے)

یہ محض قیاس آرائی ہے کہ انسانوں کی آبادی صرف زمین (ہمارے نظامِ شمسی) میں پائی جاتی ہے۔ انسانوں اور جنات کی آبادیاں ہر حضیرے پر موجود ہیں۔ ہر آبادی میں زندگی کی طرزیں اسی طرح قائم ہیں جس طرح زمین پر موجود ہیں۔ بھوک، پیاس، خواب، بیداری، محبت، غصہ، جنس، افزائشِ نسل وغیرہ وغیرہ زندگی کا ہر تقاضا، ہر جذبہ، ہر طرز ہر سیارے میں جاری و ساری ہے۔ ایک حضیرے پر ایک کھرب سے زیادہ آباد نظام واقع ہیں۔ ایک آباد نظام کو قائم رکھنے کے لئے غیر مستقل نظام اسٹور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غیر مستقل نظام سے مراد یہ ہے کہ پورے پورے نظام بنتے اور ٹوٹ جاتے ہیں اور اس ٹوٹ پھوٹ سے آباد مستقل نظام فیڈ (Feed) ہوتے رہتے ہیں۔ ہر نظام میں الگ الگ سماوات، ارض، جبال، حیوانات، جمادات، نباتات وغیرہ اسی طرح موجود ہیں جس طرح ہم اپنے نظام میں دیکھتے ہیں۔ (لائبہ شیخ۔ کراچی، کتاب: قلندر شعور)

قصہ تھا فوارہ Trevi کا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو اس کے پانی میں سکّے پھینکے گا، وہ دوسری بار ضرور روم آئے گا۔ سکّہ کسی قیمت کا ہو مگر سکّہ ہو، نوٹ ووٹ نہ ہو کیوں کہ نوٹ بہر حال کاغذ ہے اور یہ بات مشہور کرنے والے سیاحوں کے جانے کے بعد غوطہ لگا کر نوٹ صحیح سالم واپس نہیں نکال سکتے۔ چناں چہ میں نے بھی کئی سکّے پھینکے۔ یہ فوارہ ایک عجوبہ ہے۔ اس کے وسط میں دو بڑی سیپیاں ہیں۔ دائیں بائیں دو مجسمے کھڑے ہیں۔ فوارے میں سے تقریباً آٹھ لاکھ کیوبک میٹر پانی روز ابلتا ہے اور اس کی رفتار تیز اور بڑی مترنم ہے۔ (اخوت جبیں۔ ساہیوال، کتاب: تماشا مرے آگے)

روحانی حواس کو بیدار کرنے کا مؤثر طریقہ مراقبہ ہے۔ مراقبہ ایک مشق ہے، ایک طرز فکر ہے اور ایک ایسی ذہنی کیفیت کا نام ہے جو خوابیدہ حواس کو بیدار اور متحرک کر دیتی ہے۔ مراقبہ کے ذریعے ان قوتوں کو تسخیر کیا جاتا ہے جو مادی حواس سے ماورا ہیں۔ مراقبہ سے ماورائی صلاحیتیں روشن ہو جاتی ہیں۔

(یونس رضا۔ شارجہ، کتاب: مراقبہ)

خواب تعبیر اور مشورہ

ادارہ ”ماہنامہ قلندر شعور“ نے ماضی کے ان خوابوں کو دوبارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے جن کی تعبیر میں محترم عظیمی صاحبؒ نے علمی توجیہہ و تشریح بیان فرمائی اور مستقبل کی پیشین گوئی کی۔

لڑکے کی پیشین گوئی

(نام نہیں لکھا): خواب میں دیکھا کہ آسمان پر تیز بجلی چمکی اور بل کھاتی ہوئی میرے پیٹ میں داخل ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ہوا میں معلّق ایک تصویر سامنے آئی جو ایک کمزور سے بچے کی تھی۔ میں اسے دیکھنے لگی تو آواز آئی، ”اس بچے کا نام دنیا میں اور آسمانوں میں روشن ہوگا۔“ ذہن نے محسوس کیا کہ یہ لڑکا میرا ہے۔ خیال پیدا ہوا کہ یہ لڑکا اتنا کمزور ہے بھلا یہ کیا کرے گا۔ پھر آواز آئی کہ خدا ایسا ہی کرے گا۔

تعبیر: خواب بہت مبارک ہے۔ آپ کے اندر طبیعت کی پاکیزگی اور دین سے لگاؤ ہے۔ قرآن پاک میں تفکر کرنے کی عادت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ نے آپ کو مستجاب الدعوات بنایا ہے۔ انشاء اللہ، آپ کے ہاں اللہ تعالیٰ ایسا بچہ پیدا فرمائے گا جس کو آپ کی نیک طبیعت کا ورثہ ملے گا اور یہ بچہ مقبولِ بارگاہ ہوگا۔

آپ کے لئے اس فقیر کا مشورہ ہے کہ آپ کسی صاحبِ روحانیت کی زیرِ نگرانی تصوف کی راہوں میں آگے بڑھنے کا پروگرام بنائیں۔

انشاء اللہ، کامیابی آپ کا مقدر ہوگی۔

قبر میں شگاف

(جاوید اختر): سحری کے وقت خواب میں دیکھا کہ میں، میرا بھانجا اور محلے کا ایک لڑکا قبرستان گئے ہیں۔ قبرستان پہنچے تو وہاں چار پانچ لڑکے اور بھی تھے۔ قبرستان میں داخل ہو کر سب سے پہلے فاتحہ پڑھی۔ دعا کے وقت میں نے کہا، ”اللہ کے بندو! اللہ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ میری صحت ٹھیک کر دیں۔“ ایک ٹوٹی ہوئی قبر پر اچانک نظر پڑی تو دیکھا کہ اس میں کفن

میں لپٹی ہوئی میت تھی لیکن سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ یہ بتانا بھول گیا کہ اس قبر کو قبرستان میں موجود لڑکوں نے توڑا تھا۔ میں نے ان لڑکوں اور خاص طور پر اپنے بھانجے سے کہا، تم اس قبر کو ٹھیک کر دو لیکن وہ سب پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے خود قبر کی مرمت شروع کر دی۔ قبر میں دو تین سوراخ تھے جن میں سے ایک سوراخ بہت بڑا تھا۔ دو چھوٹے سوراخوں کو میں نے آسانی سے بند کر دیا لیکن بڑے سوراخ پر جب پتھر رکھا تو وہ قبر میں گر گیا۔ کئی مرتبہ یہی ہوا تو میں پتھر کی تلاش میں قبرستان سے باہر نکل گیا لیکن پتھر نہیں ملا۔ اس تلاش میں دن سے رات ہوگئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں نے دیکھا کہ قبرستان سے ایک عورت گود میں بچہ لئے ہوئے باہر آ رہی ہے۔ جب وہ قریب آئی تو میں نے اس سے کہا، ”مجھے قبر بند کرنے کے لئے ایک بڑے پتھر کی تلاش ہے۔“ اس نے بہت بڑا پتھر بغل سے نکال کر مجھے دے دیا۔ وہ گھپ اندھیرے میں پتھر لے کر قبرستان واپس آ گیا۔ لڑکے ابھی تک وہاں موجود تھے۔ میں نے ایک لڑکے سے کہا کہ تم روشنی کرو تاکہ میں اس ٹوٹی ہوئی قبر کو بند کر دوں۔ ہلکی ٹمٹماتی روشنی میں قبر کے بڑے سوراخ پر عورت کا دیا ہوا پتھر رکھ دیا اور سوراخ بند ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم جب گھر واپس ہونے لگے تو دیکھا کہ اسی قبر پر کلمۂ طیبہ لکھا ہوا ہے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک مولوی صاحب نظر آئے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور استاد کہہ کر پکارا۔ اس کے بعد میں، میرا بھانجا اور دوسرے لڑکے اونچی پہاڑی پر چڑھ گئے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر موجود تھا کہ آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: اس خواب میں آپ کی زندگی کے متعلق چار اہم باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔

① دماغی بیماریاں، ان بیماریوں میں حافظے کی کمزوری، نزلہ، ذہنی خلفشار، کاموں میں بے تدبیری اور ناروا امیدیں شامل ہیں۔

② طبیعت میں تساہل اور لاپروائی کا عنصر غالب ہے۔

③ دماغ ہوائی امیدوں اور نقشِ بر آب خیالات کی آماج گاہ بنا رہتا ہے۔

④ یہ خواب ٹونے ٹوٹکے کے رجحانات کا بھی پتہ دیتا ہے۔ ترقی کے ذرائع حاصل کرنے میں ان ٹونے ٹوٹکوں کو استعمال کیا گیا ہے۔

مشورہ: خواب کے اندر عملی زندگی کے بارے میں مشورہ موجود ہے۔ پہاڑی پر چڑھنا اور چڑھائی میں بھانجے کا ساتھ دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عملی زندگی جدوجہد اور کوشش کا نام ہے اور انہی پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ترقی اور کامیابی حاصل کرنے کا یہی راز ہے۔ باقی سب باتیں فضول اور بے کار ہیں۔

غور کیجئے کہ محض تصوراتی طور پر یہ سوچنے سے کہ ہم نے بہت عمدہ اور لذیذ کھانا کھایا ہے، کسی آدمی کا پیٹ نہیں بھرتا۔

گڑیا کے ٹکڑے کر دیے

(نسیمہ بی بی): خالہ مرحومہ ایک لوہے کے زینے پر کھڑی ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ پیروں کے نیچے سے زمین کھودیں۔ زمین میں گڑھا کر کے دیکھا تو اس میں ایک گڑیا تھی۔ خالہ نے کہا، اس گڑیا کو توڑ دو۔ میں نے گڑیا کے کئی ٹکڑے کر کے باہر پھینک دیا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک آدمی اور ایک عورت بھی نظر آتے ہیں جن کے سر پر بال نہیں ہیں۔ پہلے انہیں دیکھ کر میں خوفزدہ ہو جاتی تھی مگر اب کسی قسم کا خوف لاحق نہیں ہوتا۔

تعبیر: بیداری اور خواب میں جو آدمی اور عورت نظر آتے ہیں، دماغ کی گہرائی میں ایک حرکت ہوتی ہے، وہ حرکت یہ شبیہیں دکھاتی ہے۔ دماغ کی گہرائی میں یہ حرکت خون کے اندر نمک کی مقدار زیادہ ہوجانے سے عمل میں آتی ہے۔ نمک کا استعمال ہرگز نہ کیا جائے پھر یہ شبیہیں نظر نہیں آئیں گی۔

خون میں سرخ ذرّات

(تجمل حسین): عموماً مجھے خواب میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے مکان کی پہلی منزل سے نیچے چھلانگ لگا دی ہے اور بہت آہستہ آہستہ نیچے گر رہا ہوں۔ یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بھاگتے بھاگتے اوپر کی طرف جمپ لگاتا ہوں تو اوپر ہی اوپر بلندیوں میں اٹھتا چلا جاتا ہوں۔ نیچے گرنے پر چوٹ نہیں لگتی۔

ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ ملک چین کی سیر کر رہا ہوں اور وہاں کے لوگوں سے گھل مل کر باتیں کرتا ہوں۔ اچانک پیچھے سے کوئی شخص مجھے دھکا دے دیتا ہے اور میں ایک ندی میں جا گرتا ہوں لیکن اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے ہوا میں معلّق ہو کر دوسری طرف پہنچ جاتا ہوں۔

جیسے ہی خشک زمین پر پہنچا، جسم کو شدید جھٹکا لگا اور اس جھٹکے سے آنکھ کھل گئی۔

تعبیر و تجزیہ: جس وقت پیروں کے غدود خون کو واپس کرنے کے لئے میکانیکی حرکت کرتے ہیں تو کیمیاوی کمزوری سے دماغ کو بھی مطلع کرتے ہیں۔ اوپر سے نیچے کو آنا اسی امر کا تمثّل ہے اور جب وہ غدود کوشش کر کے اعصاب کی مدد سے کیمیاوی کمزوری پر قابو پاتے ہیں تو پھر وہ دماغ کو بھی مطلع کرتے ہیں۔ اوپر کی طرف جمپ کرنا اسی اطلاع کا خاکہ بناتا ہے۔ جب دماغ اطلاع سے مطمئن ہو جاتا ہے تو اس سے ہٹ کر کسی اور طرف دیکھنے لگتا ہے لیکن خون میں سرخ ذرّات کی کمی تصویر بن کر اس کے سامنے چینی باشندے کی شکل بنا لیتی ہے۔ جب دماغ اس کو محسوس کرتا ہے تو پھر اعصاب کی دوسری اطلاع کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہاں کسی شخص کے پیچھے سے دھکا دینے کا خاکہ بن جاتا ہے۔ خواب کی تعبیر یہ ہے کہ خون میں سرخ ذرّات کم ہو گئے ہیں۔ طبیعت بار بار تنبیہہ کرتی ہے کہ اس کمی کو دور کیا جائے۔

ملکوتی دنیا

خاکی دنیا کے ساتھ ایک دوسری دنیا آباد ہے۔ یہ دوسری دنیا مذہب کی زبان میں اعراف یا برزخ کہلاتی ہے۔ اس دنیا میں زندگی بھر انسان کا آنا جانا ہوتا رہتا ہے۔ اس آنے جانے کے بارے میں بہت سی حقیقتیں انسان کی نگاہ سے چھپی ہوئی ہیں۔ جب انسان سو جاتا ہے تو خاکی دنیا ملکوتی دنیا میں منتقل ہو جاتی ہے۔ انسانوں نے اس کا نام خواب رکھا ہے لیکن اس حقیقت پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی کہ خواب بھی زندگی کا ایک جزو ہے۔ بیداری کی طرح نیند میں بھی انسان کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے لیکن وہ جو کچھ کرتا ہے، اس سے واقف نہیں ہوتا۔ صرف ''خواب'' کی حالت ایسی ہے جس کا اُسے علم ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خواب کے علاوہ نیند کی باقی حرکات سے کس طرح مطلع ہوں۔ انسان کی ذات نیند میں جو حرکات کرتی ہے، اگر حافظہ کسی طرح اس لائق ہو جائے کہ اس کو یاد رکھ سکے تو ہم باقاعدگی سے اس کا ایک ریکارڈ رکھ سکتے ہیں۔ حافظہ کسی نقش کو اس وقت یاد رکھتا ہے جب وہ گہرا ہو۔ (کتاب: آپ کے خواب اور ان کی تعبیر)

ماہنامہ

روحانی ڈائجسٹ

کراچی

یہ پرچہ بندہ کو خدا تک لے جاتا ہے
اور بندہ کو خدا سے ملا دیتا ہے

چیف ایڈیٹر: خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر حکیم وقار یوسف عظیمی

روحانی ڈاک میں آپ کے مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کے پس پردہ لاشعور کی حقیقت کی پردہ کشائی کی جاتی ہے۔

خواتین کی زندگی کو پُرکشش، پرسکون بنانے کے لئے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

بچوں کے لئے کہانیاں اور بہترین مستقبل کے لئے راہنما اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

دین و دنیا کی خوشی حاصل کرنے کے لئے روحانی ڈائجسٹ ہر جگہ دستیاب ہے۔

adise, we have been sent to this world as punishment. Here, the passage of time is at its slowest. It is so slow in fact, that everything appears still. Due to this punishment, we do not have the capacity to perceive true time. The various stages of time mentioned in the Quran are actually levels of the subconsciousness, intended to enhance our ability to hear, see, feel, think, and understand, so that when the lights of true time manifest, our minds will not be overwhelmed by its weight.

The world has understood space and time by making assumptions but let us consider another scenario. It is said that if planet Earth is divided into four parts, three parts are water and one part is land. But upon excavation, water is found even in the land. In the atmosphere, countless clouds are floating that carry billions of gallons of water. In addition to this, there are billions of gallons of water stored in the sky which, if it were to fall down, would turn the Earth into an ocean. A humidity level of less than 40 percent in the Earth's atmosphere is considered harmful to health, meaning that even the air we breathe contains water. In this sense, what else is planet Earth other than water?

The Merciful God says,

"We made from water every living thing." (Quran, 21:30)

The Earth itself is a bubble of water. Its age is estimated to be millions of years. Larger planets are floating in the vastness of space, and all of them contain water, which is life. Could it be that planets and galaxies are also bubbles of water? If the age of planets is in millions or billions of years, how can we say that the age of a bubble made from soap and water solution is just a few moments? And likewise, if a bubble lasts only a few moments, then how can we claim that planets have existed for millions or billions of years?

We say that a bubble's life is but a moment. But does the bubble perceive time in the same way? If we were to ask the bubble, would it not say, "I am born just like you, I go through childhood, experience youth and old age, and eventually leave this world. How long is my life?"

It may ask us in response, "If our life is just a few moments long, then why does the film of life play before the eyes in a flash before the time of death? What then is the difference between us, and how did you become sixty or seventy years old?"

The Quran says,

"He will say: 'What number of years did ye stay on earth?' They will say: 'We stayed a day or part of a day: but ask those who keep account.' He will say: 'Ye stayed not but a little, if ye had only known!'. (Quran, 23:112-114)

ment, Zaid returned from Mecca to Peshawar.

It takes five to six hours by plane to travel from Peshawar to Mecca, but in his sleep state, this journey was shorter than the blink of an eye. Compare the actual flight time from your city to Mecca with the time in the world of dreams. What are the different time frames for dreams and wakefulness?

The soul moves according to the speed of the zone it is awake in. While awake in the material world, Zaid covered approximately 2,146 miles (3,453 kilometres) from Peshawar to Mecca in about six hours, and the same distance was covered on his return journey. However, in his dream, the time was reduced to zero. The distance is the same in both wakefulness and dreams, but the speed differs. If the speed of sleep were adopted in this world, one could travel faster than the speed of an airplane.

Readers! We have attempted to limit infinite time through hypothetical divisions, which is why we perceive some spaces as short and others as long.

God Almighty has explained the concept of true time to mankind through examples that align with human understanding:

"He regulates the affair from the heaven to the earth; then shall it ascend to Him in a day the measure of which is a thousand years of what you count."

(Quran, 32:5)

"To Him ascend the angels and the Spirit in a day the measure of which is fifty thousand years."

(Quran, 70:4)

"The Night of Qadr is better than a thousand months."

(Quran, 97:3)

"His command, when He intends anything, is only to say to it: Be, so it is. " (Quran, 36:82)

"And to God belongs the unseen of the heavens and the earth. And the matter of the Hour is not but as a twinkling of the eye, or even nearer. Surely God is powerful over everything."

(Quran, 16:77)

There are countless worlds in the universe and each world has its own unique space. Some are made of light, some of gas, some of matter, and others of dust. Depending on their nature and level, the passage of time varies. In other words, time is the same throughout the universe, but the rate at which it is perceived differs. In some worlds, one day (one space) feels like a thousand years; in others, one night (one space) feels longer than a thousand months. In certain worlds, one day's passage is equivalent to 50,000 years, meaning that if the phenomena of one day from that world were to be perceived by our material senses, it would take 50,000 years to complete.

Due to our disobedience in par-

their lifespan and duration of time are different. An elephant has a larger space and a longer lifespan, while an ant has a smaller space and its lifespan is several hundred times shorter than that of the elephant. The space of a bubble is larger than that of an ant but is delicate, and from a material perspective, it only lasts a few seconds. Some bubbles burst before they even grow. Similarly, not everyone in the human race reaches the stages of youth and old age. When each creature goes through the phases of life in its own space, what does it matter if the time is short or long?

Time is an infinite space. Its speed is insignificant for humans. Scholars have hypothetically divided time into different units (seconds, minutes, hours, days, years) in an attempt to slow it down and understand it. But there is nothing to back this hypothesis, as the divisions have no real connection to the actual passage of time. True time exists on its own and beyond our worldly attempts at measurement. Time simply exists in its true form.

The units of time mentioned in this article are all created by humans, and as such, it is not necessary that the days, nights, and years of other creatures are the same as those we have assumed for ourselves. From a material perspective, if a mosquito's lifespan is two months, it does not mean that this equals two months from the mosquito's perspective. It is possible that according to their time-keeping standards, this period is equivalent to 50 or 60 years.

The determination of day and night that humans have made is also questionable in this world. A full rotation of the Earth around its axis is considered one day, yet there are places on Earth where there are six months of day and six months of night. Does this mean that for them, a year is equivalent to one day? What do readers think about this?

An example of different units of time is the world of jinn. Those with spiritual knowledge have explained that according to the units of time set in the human world, when one month passes in our understanding of time, nine months pass in the world of jinn. They experience as much time in one month as we do in nine months. The space of time we refer to as one month is viewed in the same context when considering the world of jinn.

Life is divided into dreams and wakefulness. Every creature goes through these two states daily and observes two different speeds in them.

Let's take Zaid for example.

He lives in Peshawar. In his dream, he saw himself at the Holy Kaaba. He was performing *Tawaf* (circumambulation) when someone in Peshawar tapped his foot as he lay in bed. In less than a mo-

i

Bubbles

Bubbles form around a thin layer of air trapped by water. These bubbles are not created from water alone but from a soapy solution, which increases the surface tension of the water. There is a couplet by Sadaa Anbalwi: "Those who see us as mere bubbles on water, tell them: If the eye has true perception, we are the boundless ocean."

Every creation is space, and space is time. The sky, earth, sun, stars, moon, air, clouds, rain, mountains, plants, flowers, fruits, birds, animals, insects, minerals, metals, jinn, angels, *aadmi*, and *insan*; all are countless manifestations (space) of time. Some spaces appear small, and some appear large, and they all have their respective time.

For the purposes of understanding, fill a medium-sized container with water. Add soap or washing powder to it and when foam forms, take a washer, dip it in the solution, and blow on it. Bubbles will form and float in the air. These bubbles disappear when they come into contact with objects, or burst if they cannot withstand the air pressure. Children eagerly create bubbles and play with them, but the lifespan of a bubble is difficult to determine for both children and adults.

The poet Shad Lakhnavi says:

Like the foam of water, a man who vanishes in an instant,
If not a water bubble, then what else is he?

A bubble is a creation. It is commonly said that the life of a bubble lasts only a few seconds. It is born and then dies immediately, yet within that brief moment of time, it lives its entire life.

A mosquito is also a living being and it is smaller than a bubble. The lifespan of a female mosquito is approximately 42 days (about six weeks), while the male lives for about ten days. The mosquito stays in its egg for one to three days before hatching into a larva. After seven to ten days, it transforms into a pupa, and within three to four days, the pupa becomes a fully developed mosquito.

An elephant is considered a large animal. Its gestation period lasts about 22 months, which is one of the longest among land mammals. The elephant calf is dependent on its mother and stays in its youth stage for about 10 to 12 years. It usually reaches adulthood between 15 and 20 years of age. The average lifespan of an elephant ranges from 60 to 70 years in the wild.

A bubble, mosquito, elephant, flower, plant, and human are all unique creations, yet they are born at a specific time, go through childhood, adolescence, youth, and old age, and eventually disappear from this world, however,

"Humanity, we are ignorant of the true path to paradise. Come seek a spiritual master and the gates to paradise will open up." Had they known, each soul would have sought the beacon of light (master) and claimed their share of paradise.

Her heart ached realising that the awareness she possessed as a young child been obscured by the growing ego as she matured, and hence it had taken her many years to meet her spiritual master. Despite meeting him, she was still wading through the dark webs of illusion, striving to reach the light of cognition that he had kindled within her.

She could hear the giggles of her younger version – the young child, inside her. "How can I be wise like you?" she asked the child.

The child replied without as much as a pause, "I don't know."

The answer revealed layers and layers of "I know everything!" that her ego had built over her. The need to belong to the world had made her a cumulation of illusory information that had drawn thick veils over her intuition. She sighed, realising that the more she did not know, the more she would have connected to the guidance of The All-Knowing Creator. The deafening noise of "I know" had muffled the voice of guidance within her heart.

Each time she read her spiritual master's elaboration on things, she could never look at them the same way again. He peeled layers of knowledge that encased an object and laid it as elaborated spiritual and scientific concepts before the world.

As her understanding of things shifted, she noticed that the very same things began to interact with her differently and gave different results. A warm cup of tea she was served, was no more a mere means to quench her thirst, rather, it was an entire universe coming together at the behest of her Lord, to fulfill her need. A warm cup of tea did not just result in quenching the need of her physical body, rather, the deep awareness that came with it, quenched her soul too.

She had miles to go before the train arrived at the destination, so she closed her eyes and visualised her spiritual master. She observed him sitting peacefully under a cascade of white light, seated before him were multiple versions of herself. The young child looked the happiest, for her world revolved around him. The remaining versions represented the different phases of her life, each accompanied by its own baggage. He was silently lifting the weight of the baggage. Those versions that easily let go, vanished as light into the light, and those that did not, continued to sit under his loving gaze. Her heart swelled in happiness – her master would not give up on her.

iii

Memories swept her to a time when she was a young child. Her parents had taken her to a spiritual man and requested him to initiate her as his disciple. But she had persistently resisted with all her might and refused to seek spiritual initiation.

After a few failed attempts, the spiritual man had smiled kindly and advised the parents, "Please do not force her to accept me as her master. The matters of the heart are under the jurisdiction of Divine love. Your daughter will meet the spiritual master who is assigned to her in time."

She recalled how her parents reluctantly agreed, their faces reflecting great disappointment and fear. Being a parent herself, she could understand her parent's fears about the unknown path their little daughter would embark on. She wished her parents knew that the path towards one's spiritual master is the path that is already known to the soul much before it manifests in the physical world.

The seeker reaches a point of deep introspection and begins the journey into their hearts. It starts with an intense realisation that this material world is not a destination, rather, it is only a stopover. A deeper knowing then pushes the seeker to realise that they were created for something more profound and valuable. This feeling is followed by pangs of unbearable yearning to meet God, pushing them to search for the beacon of light that can illuminate their darkened heart and lead the way. A spiritual master appears at the right time, that is, when the student is ready. The first glimpse of a spiritual master to a seeker is like the relief felt by a person lost and dying alone in the harsh desert, when they see the outstretched hand of a rescuer.

> "Everything we earn and achieve in this world in material terms, turns into trails of dust, trampled under the feet of the future generations. The only wealth that transfers with us is the spiritual wealth (awareness of God) we've earned through life. The seeds that we plant in this world bear fruit in the afterlife."

❁ ❁ ❁

After years of yearning for God and praying for a spiritual guide to be sent her way, it was ironic that, when she finally met her master, she still struggled to fully grasp the significance of the spiritual allegiance. She remembered the *hadith*,

"Heaven lies under the feet of your mother."

She could not deny that a *Murshid* is a spiritual mother beholding the essence of the love of God – the love of more than 70 mothers. The day she met her spiritual master, her heart wanted to scream from the rooftops,

membered reading the wisdom of Sheikh Abdul Qadir Jilani (RA):

"Spiritual poverty is not the lack of wealth, rather, it is one's inability to give up their attachment to wealth. Only a heart empty of worldly desires is filled with Divine light."

She peered inside her heart and saw herself as a spiritual pauper too. Her heart wailed,

The pennies I earned when you polished my soul,

I gambled away, lost to my own follies, my beloved master.

It's your prayers that drew God's mercy upon me,

For without them, destitute I'd be,

Wandering the dark alleys of ignorance.

My existence melts in gratitude for you,

For creating a safe haven within your heart.

❁ ❁ ❁

Holding back her tears, she looked up and saw the structure of the train emerge through the thick veil of smoke. Getting into an empty compartment, she took a seat by the window and gazed at the scenes passing by. The town they were travelling through reminded her of the one that she grew up in as a child. Many decades had passed since, and yet, her memory held clear images of those years.

She reminisced on how her ancestral house was near the railway station and each time a train passed by, she would be excited. She often wondered if the strangers on the train would ever meet again, and even if they did, would they remember their earlier encounter? She knew only those encounters that leave an impact are remembered. For her, the train journey symbolised life, and the passengers were simply the people who moved in and out of her life.

She remembered sobbing before her spiritual master, mourning the loss of all her loved ones. His soothing voice had calmed her, "No one knows how many have come and gone on this journey of life. What prevails are the bonds that we have made."

His words had revealed the temporary nature of everything, and also highlighted the importance of focusing on the essence of each relationship and the purpose it served. Each relationship acts as a catalyst for transformation. She was grateful that her master allowed her to form a deep connection with him — one that helps her absorb his way of thinking, discipline her emotions, and ultimately direct her devotion toward the higher goal — that is, cognition of self and, through it, cognising God.

❁ ❁ ❁

i

The Train Journey

"No one knows how many have come and gone on this journey of life. What prevails are the bonds that we have made."

She glanced around the train station and saw that it was strangely empty. The cool winter breeze swept past, sending a shiver down her spine. She tugged her woolen shawl tighter around her shoulders, and the contrast between the chill and warmth reminded her of her spiritual master. His presence is a cool breeze that counters the harsh, scorching heat of the material world; a warm embrace like a shawl that protects one when the world around grows cold and devoid of compassion. She was immersed in the bliss of memories of him, when the sharp sound of the approaching train whistle jolted her back to the present moment.

Her heart hummed a hymn she sang in school,

"Not a shirt on my back,
Not a penny to my name,
Lord, I can't go back home
this away."

As a teenager, she had assumed the lyrics meant she needed to achieve material wealth and success to earn God's pleasure and audience. But now, her spiritual master's words of wisdom constantly resounded in her mind:

"Everything we earn and achieve in this world in material terms, turns into trails of dust, trampled under the feet of the future generations. The only wealth that transfers with us is the spiritual wealth (awareness of God) we've earned through life. The seeds that we plant in this world bear fruit in the afterlife."

The teachings of her spiritual master had taught her that the path to the Creator is certainly not through the dusty, stench-filled roads of materialism. Rather, it is a path that is illuminated by Divine light, purified by the tears of those who yearn for the Beloved, and fragrant with the pure scents of certitude and sacrifice of the Prophets (PBUT) and Saints*. Only those who perform ablution through constant invocation, and strive to cleanse themselves of the reek from the decaying world by following the life of the Prophets (PBUT), progress on this sacred path and cognise God.

❁ ❁ ❁

Her heart now interpreted the hymn through the light of her spiritual master's wisdom. It seemed that the poet was wondering how he could think of returning to God while being spiritually penniless through his worldly life. She re-

* *Saints = Friends of God*

with dust again,
After that, who will know, then what?

For the guidance of humanity, approximately 124,000 Prophets of God (PBUT) came into this world. All of them conveyed the message that desires should not be such that they take a person away from the truth.

It is stated in the Holy Quran,

"And withhold yourself with those who call on their Lord morning and evening desiring His goodwill, and let not your eyes pass from them, desiring the beauties of this world's life; and do not follow him whose heart We have made unmindful to Our remembrance, and he follows his low desires and his case is one in which due bounds are exceeded. "

(Quran, 18:28)

People of wisdom often say that desire ends desire. A good desire overcomes a bad one. Just as the staff of Prophet Moses (PBUH) swallowed all the serpents before him. Nimrod, Pharaoh, and Korah possessed great wealth, but Prophet Abraham (PBUH) and Prophet Moses (PBUH) chose to align their desires with the will of their Lord – and thus, they prevailed.

While treating patients in the hospital, there are moments, however brief they may be, when I pause to reflect on the desires we relentlessly pursue. Have these desires led us into deception, or have they revealed to us the true essence of peace? I also think about how when we are healthy, we often fail to appreciate life, yet when we fall ill, we yearn to live fully. Both patients and their families strive to keep resentment at bay, fostering love, gentleness, and friendship. They aim to make the most of the time they have left, living with forgiveness and joy. What does this phenomena reflect?

It also crosses my mind that we carry our files full of desires to request prayers from a *Faqeer* (a friend of God), but does anyone ever say to them,

"I have come to meet you with the intention of following the path you have chosen?"

The patient caught in the struggle between life and death, and those who are indifferent to the importance of life, reveals one truth about mankind: the greatest idol is mankind itself. Day and night we are immersed in our own worship, wanting certain things and rejecting others. What I want should happen, what I don't want should not. If one does not abandon worshipping themselves, they will never be free from fear nor acquainted with true happiness.

The Seal of the Prophet, Prophet Muhammad (PBUH) says:

"True wealth is not in the abundance of material possessions, but in the wealth of the soul."

but deception." (Quran, 4:120)

Desires are linked to intention and purpose. If the purpose is worldly, then the outcome of those desires is deception. Worldly progress is quantitative; it entangles one in material wealth, promotes superficiality, and distances a person from inner truth.

"Abundance diverts you, until you come to the graves."

(Quran, 102:1-2)

The Renowned Sufi scholar, Hazrat Khwaja Shamsuddin Azeemi (RA) states:

"Man is a slave to his desires. When one desire is not fulfilled, another one takes its place. When the second is not fulfilled, a third, fourth, and fifth arise; and this chain of desires becomes so overwhelming that a person's true self is hidden beneath the layers of these desires. It never happens that every desire is fulfilled, nor has it ever happened that all of a person's intentions are realised. A person's desires and longings become the very centre of their actions."

(Book: Baray Bachon Ke Liye)

Having desires is natural. The real difference lies between superficiality and truthfulness.

A mother says she wants her child to receive good education: this is a natural desire. But then she says the child will study, get a good job, and provide for the family: this is an unnatural desire. According to social and moral expectations, the child will grow up and fulfill responsibilities. But who provided for the mother before the child was even born? And who gave sustenance to the child in the mother's womb?

If we do not incorporate the inner, spiritual dimensions in a child's upbringing, they begin to consider material comforts as the essence of life. One should certainly strive to improve their standard of living, but in doing so, one must not lose sight of their true self.

Becoming wealthy is the desire of almost every person. But is every wealthy person happy? Look around and see how many faces seem happy or otherwise. Desires influenced by materialism create unhappiness, fear, and despair.

The poet Qamar Jalal Abadi said:

I will amass wealth and power,
but then what?
I will take a grand house, but then what?
I will organise beautiful gatherings of poetry and prose,
I will be famous in this world,
but then what?
When the waves come, I will travel around the world,
But will return to the same old town, then what?
One day, death will knock on the door of life,
The lamp of Qamar will extinguish, but then what?
Dust will rise, and will merge

that he had made a list of tourist attractions and planned to visit them before leaving.

I thought of the Filipino patient and realised that if I suggested sightseeing to him, he would definitely consider it a waste of time, as he wants to spend his remaining days with his family. And yet, for my friend, tourism is the best way to spend the next four months.

If we were told that we only had four months remaining in this world, what would we do? What form would our desires take? Which routines would we abandon, and what activities would we take on? What would be the last tasks on our priority list before leaving this world?

Respected readers, please share your answers in writing.

When a child is born, desires arise in the hearts of the parents. From naming the child to selecting clothes and toys, there is a long list of things to consider. They think about what steps should be taken regarding proper nutrition and upbringing, which school to admit the child to, and what the child will grow up to become. The desires of the grandparents on both the paternal and maternal sides are different.

As the child grows, they develop their own desires. School, college, childhood, youth, employment, establishing themselves, a successful career, travel, recreation – countless thoughts come and go until one eventually leaves this world with many unfulfilled dreams.

There is something to reflect on:

- Are all wishes and desires fulfilled?
- Is having desires inherently positive or negative?

Desire also arose in the heart of Prophet Adam (PBUH), but it was due to the deception of Satan, as a result of which he was expelled from Paradise. Satan also had a desire – that he be granted permission until the Day of Judgment to mislead every human being in the world. His heart was filled with the fire of revenge. Upon realising his mistake, Prophet Adam (PBUH) humbled himself, sought forgiveness, and desired to draw closer to his Lord.

Both desires were granted: One led to being cast away from Divine mercy, while the other was given the glad tidings of nearness to the Most Merciful. Upon being cast away, Satan said:

"I will mislead them, and I will create in them false desires; I will order them to slit the ears of cattle, and to deface the nature created by God. Whoever, forsaking God, takes Satan for a friend, hath of a surety suffered a loss that is manifest." (Quran, 4:119)

The Lord of the Worlds, God Almighty, said:

"Satan makes them promises and creates in them false desires; but Satan's promises are nothing

i

Desires

"Dr. Muneebuddin Kareem studied and completed his education in Radiation Oncology in Pakistan. As of late, he is undergoing advanced specialisation in cancer treatment in Canada."

Thousands of desires, so intense that they be worth dying for;
Though many fulfilled, they were yet still too few.

—Mirza Asadullah Khan Ghalib

A 40-year-old Filipino man came before me as a patient, his parents sat beside him. His records stated that he had been battling lung cancer for nearly two years, which had now metastasised and spread to his brain. He had been referred to me for an opinion regarding radiotherapy treatment. He had already undergone several types of chemotherapy, but his cancer remained aggressive.

I looked at him intently. No one could have guessed that he was suffering from a life-threatening illness. According to scientific research, patients in the final stage of cancer survive for no longer than four months. Yet beyond the limits of medical knowledge, we believe that life and death are in the hands of God. He can make the next moment our last, or He can stretch a second into years. This is the power of God.

I asked if he agreed with the treatment suggested. He said that he wanted to undergo treatment till his last breath, so that he could spend more quality time together with his family.

After he left, I thought about how different the room I sat in was to the outside world. The nurses were busy with their tasks, the clerk gave appointments, and the hospital administration was preoccupied with thoughts of expansion and development. Meanwhile, the only thought in the mind of patients was of how many days of life remained for them. Stepping out of the hospital, the hustle and bustle of life makes it seem as though no one remembers that they too will one day leave this temporary abode. In the streets you see the transient affairs of this fleeting world come to life – everyone is absorbed in their own concerns. The priorities of world inside the hospital and the word outside are heavily contrasted. On one hand, a patient grieves over their upcoming removal from this temporary abode we call 'the world', and on the other, a worker waits for the clock to strike five so they can head home.

When meeting a friend, he happily shared that he had completed his training and, after four months, he would have to return to his country, for which he had already started preparing. He said

V

Information streams from the subconscious and spreads across the universe. Within this information are revelations about the creation and its composition. These revelations are for everyone. The point is that a human being is inherently a doctor, engineer, teacher, writer, tailor, blacksmith, scientist, spiritual being, and also the entire universe. Because, the information comes from the subconscious, and is recorded in their consciousness. It is up to an individual how much they awaken their consciousness, and how much they benefit from the research ability (subconscious) present within them.

Every human being is spiritual in nature, and one of the reflections of this is the power of sight. For example, on earth, *aadmi** cannot see beyond 150 feet, yet when they look up at the sky, they are able to see the sun, assumed to be at a distance of 93 million miles and the moon about 25 million miles away. It is worth contemplating that *Aadmi** possesses the ability to see – at both the minimum level and at the maximum too. For instance, when they free themselves from the grip of earthly gravity even for a brief period of time, their sight travels as far as 93 million miles in an instant. But when they confine themselves to the gravity of the Earth, the sight can no longer travel far and is restricted to just a few steps ahead. When a person no longer depends on the eye that perceives the moon and the sun as millions of miles away, and instead, turns their mind inwards, then both the secrets within them and the secrets of the universe can be revealed to the inner eye.

May God protect you.

**Aadmi refers to an individual who is unaware of the inherent spiritual abilities that exist within them.*

They are the spiritual heirs of the Prophets (PBUT) and the seal of the Prophets – Prophet Muhammad (PBUH). It is said that the friends of God see through the eye of the heart, travel through the transcendental worlds, contemplate the world beyond the conscious, and understand the messages of the subconscious. When certain states or experiences descend upon them, they realise that whatever the conscious expresses and understands, is not their personal ability, but rather a playback of a subconscious record. Both the subconscious and conscious are a collection of waves charged with negative and positive energies. Since the friends of God give precedence to God above all and reflect on the universe with the same devotion, they see the wisdom in it, as much as God wills.

• • ——————————— • •

With modern scientific advancement, understanding the conscious and the subconscious has become easier. Consider the example of a radio. It speaks through various short and medium waves. The listener can listen to a radio speak, only when sounds arriving from the wireless system are stored in it and streamed, otherwise, the radio is merely an empty box. Writing, speaking, and visuals are all various forms of sound, and all expressions of mass communication, whether old or new, relies on it.

The consciousness of creatures is similar to a radio, TV, smart phone, or computer and the sounds and images that are broadcast through them, depend upon satellites or mobile towers. In other words, human consciousness, like those devices, is a box full of wires whose source of information is the subconscious. The streaming of information from the subconscious is continuous. Sometimes it takes the form of poetry, sometimes scientific discovery, and at other times, the waves of discovery are shaped into a research-focused, observational, and transcendental mind.

• • ——————————— • •

What is your understanding after reading the *Message of the Day*? The impressions of the words written in black on white paper appeared before you and you studied them with a focused mind. If the following summary matches the insights that have illuminated the empty spaces of your mind, then the message has been understood.

Now read the Summary of the *Message of the Day*.

4. We have approximately 10,000 years of history, and within this span, the period referred to as "B.C." dates back more than 2000 years – for example, 500 BC or 200 BC (2500 and 2200 years ago, respectively). The term B.C. is used because we do not have historical records that go further back than 2000 years. However, when we pay attention to the different eras of history, we realise that there have always been people in every era who recorded historical events.
5. Experts in technical skills, whom we refer to as craftsmen, have existed since the beginning of life on Earth. Just as in the present era, craftsmanship existed in the times when fire was discovered, as well as in the stone and metal ages.
6. It is often said that science exists only in the West and Europe, but the truth is that science exists in every region of the world, and has been continuously present in every era. There are scientists at different levels of proficiency. It is a different matter that some scientists initiate research, whereas others take it to advanced levels. While in the earlier times they were called '*Hakeem*', in the present era, they are known as scientists, and their pursuit of wisdom is rooted in deep contemplation.

• • ——————— • •

Law: All branches of knowledge and their presence on earth are a part of the communal system.

Nothing exists as a sole entity, neither is it limited. All fine and diverse arts are connected to the consciousness, yet, they cannot be classified completely as the consciousness, because, be it the knowledge of a cobbler, carpenter, tailor, architect, farmer, poet, engineer, or a machine-maker, it descends upon their consciousness. Unless pressure is applied to the consciousness, and the image is projected on its screen, the consciousness remains idle with limited understanding. The consciousness receives and broadcasts the information from the subconscious. Therefore, the stronger and higher the frequency of the consciousness, the more deeply the subconscious impressions are embedded in the mind.

• • ——————— • •

Every stream of knowledge is a caravan and is not limited to any one individual. One such caravan is that of the friends of God.

lines and what does it mean?

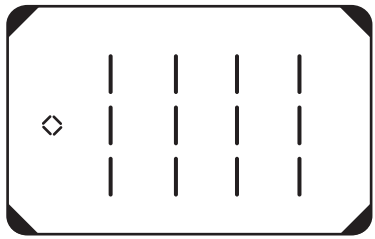

In the communal system of the universe, nothing exists solely for any being. What appears as an individual is in fact a collection of different elements. If sunlight is separated from flowers and leaves, and moonlight from fruits, then neither will the flowers bloom, nor will the fruits appear. Similarly, if the element of wood is extracted from paper, or water from wood, and oil from water, the sources of heat on Earth would be suspended, and with them, the plants, minerals, animals, insects, metals, jinn, and mankind will go extinct. This is the definition of a communal system.

One of the major manifestations of the communal or group system is 'Information'. Information arrives from the subconscious, and keeps life operative. It is not reserved for one person, rather, it spreads throughout the universe, and every person* accepts or rejects it according to their inclination. Another example that proves that information is universal is that whether a person is an artist, poet, teacher, pilot, doctor, astronaut, or belongs to any other profession, there are thousands of women and men in this world who possess the same skills. No single individual is a sole engineer, cartographer, or geographer – these abilities are active simultaneously in thousands and millions of people. Their specialisations may vary, but a doctor remains a doctor. Likewise,

1. Whether a person paints on paper, leaves, walls, canvases, or inside caves – they are an artist.
2. A person sings *Ghazals* (form of poetry), another recites free verses, one has proficiency in couplets, while another elevates the genre of quatrains to its pinnacle – all of them are referred to as poets.
3. From seven musical notes, uncountable *Ragas* have been composed. There are innumerable people who perform them with great skills. If 200 languages are spoken in the world, then poets exist in each of them.

---

* *Every person=Creations*

i

Message of the Day

The universe is a communal system where individuals represent their species, and the species, are a reflection of its individuals. The basic unit of this communal system is a family, and a family is a group that is classified into various categories. Pigeons, ants, elephants, mountains, water, etc., are all different categories among creations, but they possess the same attributes that are present in mankind. Countless creatures are a part of this communal system that serves as a means to recognise each other.

Respected readers! Reflecting on the eight lines above leads us to the awareness of nearly 11,000 species spread across the vast and magnificent belt of the universe. The existence of these species is based on senses. Their connection with each other, mutual introduction, the attraction and repulsion between them, the interplay of the unseen and the seen, urges and their limits, sustenance and dwelling – in other words, their life and death, are all interconnected through the mechanism of senses.

Equation: When the Creator of the universe intended to manifest creation, the universe came into being.

Every word is layered with meanings and interpretations. When one contemplates the essence of these layers, it becomes evident that each creation embodies countless other creations within itself. If we take the above equation as a guide to understand this law, a diagram will unfold. Now tell me, what form emerges by arranging these lines in different directions? This is the formulae of creation and composition of the universe.

Readers! The brain is a single organ; however, it consists of two parts. When we look at its internal structure, there are trillions of permanent cellular compartments within it. Every compartment is interconnected and serves as a record.

To understand this secret, turn over the layers of your memory and tell us, what image emerges through the arrangement of these

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	136
Desires	Dr. Muneebuddin Kareem (Canada)	131
The Train Journey	Bibi Anuradha (UAE)	127
Bubbles	Azhar Hussain	123

"One does not reach God, until they break the effigy of their *Nafs* (self)."

— Bibi Saima (RA)

Vol13 Issue5 | June 2025 | Dhul Hijjah – 1446AH
Muharram – 1447AH

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in Chief
Huzoor Qalandar Baba Auliya[RA]

Chief Editor
Hazrat Khwaja Shamsuddin Azeemi[RA]

Editor
Hakeem Salam Arif

Circulation Manager
Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.140/- Per issue. Annual subscription Rs.2100/- with Reg. Post (Domestic), US$ 75/- (International)

**Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town
Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020**

DENTAL innovations CLINIC

Happy Smile

The secret of the Beautiful Smile

Whiter than White .....!!

Center of excellence for Braces & Dental implants

Aesthetic Dentistry
Teeth Whitening, Porcelain Crowns, Veneers, Ceramic Restorations

Restorative Dentistry
Root Canal Treatment, Crown & Bridge

Orthodontics
Fixed & Invisible Braces

General Dentistry
Extractions, Fillings, Dentures

Preventive Dentistry
Pit Fissure Sealants, Root Planing

Minor Oral Surgery
Impactions, Cyst, Apicoectomy

Pediatric Dentistry
Space Maintainers, Steel Crowns

DENTAL INNOVATIONS CLINIC

Mezzanine Floor AKU Lab 26th Street
BADAR Commercial Phase V, DHA, Karachi
dentalinnovations747@gmail.com | www.dentalinnovationsclinic.com
Dental Innovations Clinic
0300-8511747 | 021-37242559 | 021-35242559

New Homes For Sale in Multan & Lahore

For More Details : +92 345 4121 910

FL 5 & 6, Block B, Gulshan-e-Jamal
Rashid Minhas Road, Karachi.

f: lavishdinerestaurant

Lavish Dine
Restaurant

www.lavishdinerestaurant.com

- Party up to 400 Persons
- Affordable Party Menus
- Buffet
- À la carte

Ph: 021-34570423
Cell: 0333-3538004

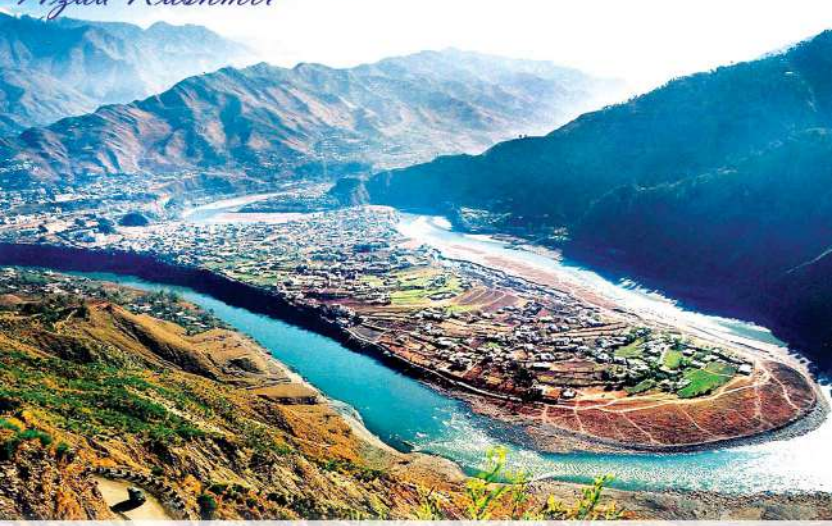

SANGAM HOTEL MUZAFFARABAD

HOSPITALITY IS OUR TRADITION

We serve famous delicious Cuisines, offer Air conditioned Rooms, Suites, well equipped Wedding and Conference hall and great Customer service.

Phone No: +925822444194-5 Fax No: +925822442587

Email:sangamhotel@hotmail.com

دنیا کے بڑے کاروباری مراکز میں سے ایک

دبئی میں اپنے کاروبار کا آغاز کیجئے

کمپنی رجسٹریشن سے ویزا حصول تک
تمام مراحل کی باسہولت اور تیز رفتار تکمیل کے لئے قابل اعتماد نام

- اسٹور ویب ڈیویلپمنٹ
- امپورٹ ایکسپورٹ
- ریسٹورنٹ
- ٹریڈنگ
- ہوٹل
- ٹرانسپورٹ
- ای کامرس
- آئی ٹی سروسز
- کنسٹرکشن
- رئیل اسٹیٹ
- ٹریول اینڈ ٹورازم
- ایمیزون آن لائن

FREEZONE LICENSE PACKAGE

AED22500

PACKAGE INCLUDED

BUSINESS LICENSE | FLEXI DESK | INVESTOR VISA | EMIRATES ID | MEDICAL REPORT | E-CHANNEL PORTAL

ہر وہ کاروبار جو آپ کی ضرورت ہے!

RB
RED BERRY
CORPORATE SERVICES

1408, Opal Tower, Business Bay Dubai UAE
info@redberry.ae | +971 50 931 0752
www.redberry.ae | +971 56 336 9852

/BUSINESSINDUBAI.AE/ /company/redberryae/ /red_berry_corporate/

TOYOTA

the all new

TOYOTA YARIS

DYNAMIC FRONT BUMPER & GRILL

SLEEK DAY TIME RUNNING LIGHTS

STYLISH MACHINE FACE ALLOY RIMS

RETRACTABLE SIDE VIEW MIRRORS

LUXURIOUS BLACK INTERIOR

9" FLOATING DISPLAY WITH APPLE CARPLAY & ANDROID AUTO

SHARP REAR CAMERA

3 AIR BAGS

PUSH START

STARTING FROM

4,479,000

Move your world

FOR BOOKING & DETAILS PLEASE CALL:

UAN: (022) 111 555 121 or 0348-111 9705

TOYOTA HYDERABAD MOTORS SITE, AUTO BHAN ROAD